قتیل شفائی

برگد

غزل، نظم، دوہا، رباعی، خماسی
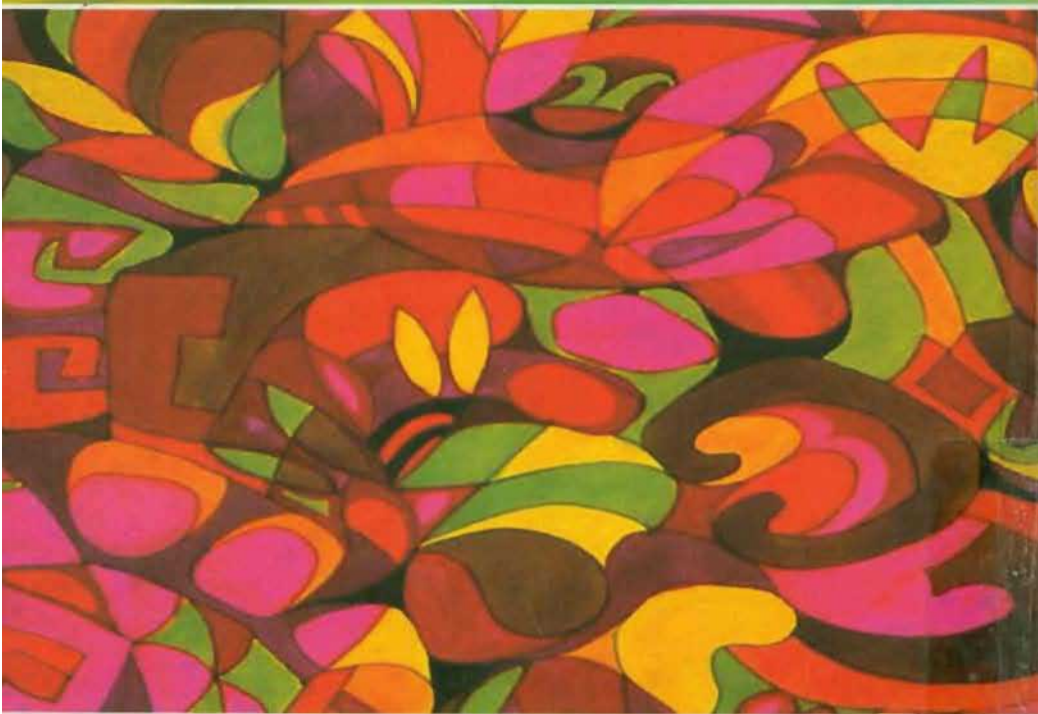
غزل ، نظم ، دوہا ، رباعی ، خماسی

سنگِ میل پبلی کیشنز ۔ لاہور

2004

نیاز احمد نے
این کیو پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

تعداد ـــــ ایک ہزار
قیمت ۳۰۰/۰۰ روپے

ISBN - 969 - 35 - 0636 - 7

مرحوم بہن کے نام

جس کے پیار کے برابر کسی بھائی کو
اپنی بہن کا پیار نہ مل سکا ہو گا

بیوی کے نام

جس کا زندگی بھر کا بے نام و نشاں
ایثار، مر کے بھی نہ بھلا سکوں گا

ترتیب

اِبتدائیہ

گھٹا چھم چھم برستی ہے، تو چڑیا چہچہاتی ہے
مگر مَیں کیا کروں مُجھ کو ہنسی دونوں پہ آتی ہے
کہ وہ اِک لمحہِ موجود کی جھُوٹی گواہی پہ
کبھی رو کر کبھی ہنس کر
غموں کا بھی خوشی کا بھی یقیں کرتی چلی جائیں

اگر چھم چھم برستی یہ گھٹا
اور چہچہاتی ناچتی چڑیا
اجازت مُجھ کو دے سکتیں

تو مَیں غم اور خوشی کے سارے موسم
اپنے بس میں کر کے دِکھلاتا
مَیں ہر منظر میں
سب اسرارِ پس منظر کے دکھلاتا
کہ مَیں انساں بھی ہُوں
شاعر بھی ہُوں
اور سوچتا بھی ہُوں
مجُھے تو آنسوؤں سے اور اپنے قہقہوں سے
مشیت کے خلاف اِک اسلحہ خانہ بنانا ہے
نہیں آتا کِسی کے تابعِ فرماں مجھے ہونا
مَیں خود مختار جینا چاہتا ہُوں
مَیں خود مختار مرنا چاہتا ہُوں

دُعا

اے خُدا اِک ایسی تُو، مُجھ کو زندگانی دے
جو مرے ارادوں کو، عُمرِ جاودانی دے

بات، ابھی یہ کل کی ہے، مَیں تھا حرف کا حاکم
کھو چُکا ہُوں مَیں جس کو، پھر وہ حُکمرانی دے

آج بھی کھڑا ہُوں مَیں، بچپنے کی سرحد پر
تُو مری بلوغت کو، شعلۂ جوانی دے

چُپ ہُوں ایک مُدت سے میری سوچ گونگی ہے
میری بے نوائی کو، تُو ہی کچُھ معانی دے

نفرتوں کا مارا ہُوں، غم کا استعارہ ہُوں
کم سے کم محبّت کی، مُجھ کو ترجمانی دے

ہو مقابلہ میرا، دشمنوں سے کیوں آخر
بد زباں اگر وہ ہیں، مُجھ کو خوش بیانی دے

مَیں قتیل پہلے ہی، قحط کا ستایا ہُوں
میرے کھیت پیاسے ہیں، کوئی اِن کو پانی دے
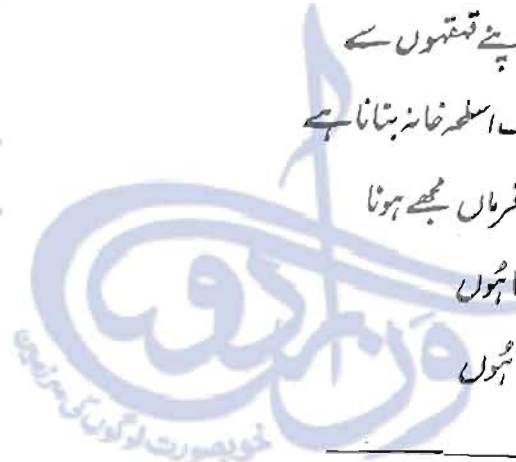
روشنی، اے روشنی

اے روشنی، اے روشنی
کرنوں کی پایل باندھ کر، اس شہر میں چھم سے اُتر
اے روشنی، اے روشنی
مانا کہ لمبی رات ہے، اِک خوف اس کے ساتھ ہے
پر تُو اندھیروں سے نہ ڈر
اے روشنی، اے روشنی

مُجھ کو خبر دی چاند نے، تُجھ کو یہ دھرتی بھا گئی
تُو آسمانوں سے چلی، اور میرے گھر تک آ گئی
سارے اندھیرے چھٹ گئے
آنکھوں سے پردے ہٹ گئے
جب سے بنی تُو ہم سفر
اے روشنی، اے روشنی
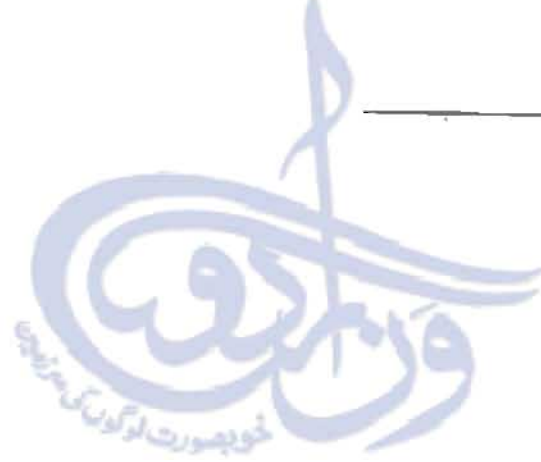
گھر کو کھُلا رکھا سدا ، مَیں نے اُجالوں کے لیے
تُو زندگی کی لہر ہے ، میرے خیالوں کے لیے
شمعیں جلا ادراک میں
تارے کھِلا اِس خاک میں
جگمگ کریں دیوار و دَر
اے روشنی اے روشنی

آ کر مِرے اِس شہر میں ، کر دے چراغاں چار سُو
ایسا دِکھا منظر کوئی ، سب کو ہے جس کی آرزُو
گلیوں کی رونق بن کے آ
سب راستوں کو جگمگا
سارے مکانوں پر بکھر
اے روشنی ، اے روشنی

☀

جب بھی کہتا ہوں کوئی تازہ غزل تیرے لیے
میرے احساس میں کھِلتے ہیں کنوَل تیرے لیے

جانتا ہُوں کہ مِرا دشمنِ جاں ہے ، پھر بھی
دِل کی ہر بات یہ کرتا ہُوں عمل تیرے لیے

دشمنی یُوں تو کِسی سے بھی نہیں ہے میری
صِرف حالات سے ہے جنگ و جدل تیرے لیے

آنکھ جمنا ہے مری اس کے کنارے آ جا
مَیں نے بنوایا ہے اِک تاج محل تیرے لیے

اپنا گھر غور سے دیکھا ہی نہیں تُو نے قتیلؔ
یہ تو دُنیا میں ہے جنّت کا بدل تیرے لیے

✺

تیری راہوں میں بھٹکنے کے لیے زندہ ہُوں
مَیں ازل ہی سے ترے حُسن کا جوئیندہ ہُوں

تیرے دل کی بھی منزل پائی مجھے شہرت
کِس سے پُوچھوں کہ مَیں کِس مُلک کا باشندہ ہُوں

بھا گئے تھے تری آنکھوں کے سمندر جن کو
مَیں اُنھی ڈُوبنے والوں کا نمائندہ ہُوں

دیکھنا ہے تو مجھے ایک نظر دیکھ ہی لے
صُبح کا تارا ہُوں لیکن ابھی تابندہ ہُوں

کسی جُوڑے میں سجایا نہ گیا جو مُجھ سے
مَیں قتیلؔ آج بھی اُس پھول سے شرمندہ ہُوں

شعلہ

جب اُس نے بنایا ہے مجھے بندۂ بے دام
وُہ خود ہی مرا کاتبِ تقدیر بھی ہوگا
اب ہاتھ ملایا ہے جو اُس نے تو کسی دن
اللہ نے چاہا تو بغل گیر بھی ہوگا

راکھ

تم کر چکے ہو مجھ سے ابھی جس کا تذکرہ
وہ تو کسی حسین پہ مرنے کی عُمر ہے
ہاں رکھ چکے ہیں جس میں قدم اب تم اور میں
یہ عمر سارے شہر سے ڈرنے کی عُمر ہے

✺

سُورج مرے دِل میں جل رہا ہے
یہ موم کا گھر پگھل رہا ہے

اُٹھا تھا دُھواں بس اِک مکاں سے
اب شہر کا شہر جل رہا ہے

یہ شہر جو اَب ہے نوحہ نوحہ
پہلے تو غزل غزل رہا ہے

اُس گھر سے ہَوائیں بے خبر ہیں
جس گھر میں چراغ جل رہا ہے
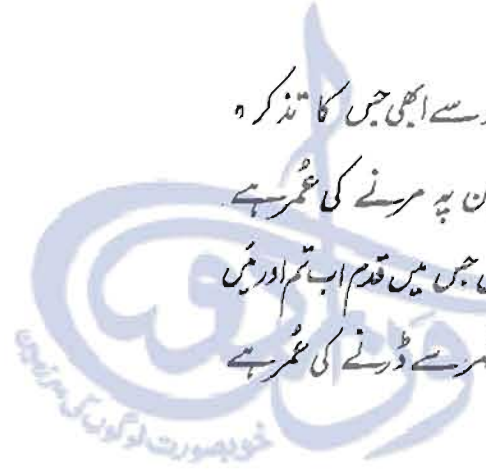
اس دھوپ میں یہ بھی ہے غنیمت
سایا مرے ساتھ چل رہا ہے

بن جائے نہ ایک روز ایندھن
وہ پیڑ جو پھول پھل رہا ہے

کیچڑ میں تو چل رہی ہے دُنیا
اور پاؤں مرا پھسل رہا ہے

سُنتے ہیں قتیلؔ پھر سے موسیٰ
فرعون کے گھر میں پل رہا ہے

☼

زخموں کو گلاب لکھ رہے ہیں
جیسے کوئی خواب لکھ رہے ہیں

پانی کو بنا کے روشنائی
شعلوں کا جواب لکھ رہے ہیں

ہم اپنی خوشی سے اپنے تن پر
موسم کا عذاب لکھ رہے ہیں

وہ سامنے رکھ کے چکنا کاغذ
بارش کا حساب لکھ رہے ہیں

پڑھتے ہیں قتیلؔ ہم تو چہرے
اور آپ کتاب لکھ رہے ہیں

بانجھ موسموں کی راگنی

بسنت بھی نہیں کہ حرف رنگ لوں
پیلے پیلے رنگ میں
بہار بھی نہیں کہ پھول ٹانک لوں
کسی نئی اُمنگ میں
خزاں بھی وہ نہیں کہ خشک پتیاں
اداس میں بھگو سکوں
سماں بھی وہ نہیں کہ جس کی تلخیاں
سُرور میں ڈبو سکوں

گنگ اپنے ساز کی
ایک ایک جھانجھ ہے
کس طرح بشارتوں کا ہو جنم
جب دُلہن ہی موسموں کی بانجھ ہے

✺

دُنیا مری آباد ہے جس راحتِ جاں سے
دیتا ہُوں دُعائیں اُسے دھڑکن کی زباں سے

حیرت سے دکانیں مرا منہ دیکھ رہی ہیں
شیشے کا خریدار ہُوں پتھر کی دُکاں سے

ایسا وہ کہاں جیسا غزل میں نظر آئے
سب حُسن ہے اس کا مرے اندازِ بیاں سے

تم ہاتھوں کو بیکار کی زحمت سے بچا لو
دستک کا جواب آتا نہیں خالی مکاں سے

رکھے جو قتیلؔ اپنے سمندر کو چھپا کر
شکوہ ہے مری پیاس کو اُس پیرِ مغاں سے

روشن وہ مرا گوشۂ تنہائی تو کر جائے
یادوں میں سہی، انجمن آرائی تو کر جائے

یہ میری ضمانت ہے کہ پائے گا وہ شہرت
تھوڑی سی وہ پہلے مری رسوائی تو کر جائے

کر دوں میں اُسے عقل کے مفہوم سے واقف
کچھ دن کے لیے وہ مجھے سودائی تو کر جائے

سب کہتے رہیں میں اسے قاتل نہ کہوں گا
لیکن وہ کوئی کارِ مسیحائی تو کر جائے

میں دیکھ سکوں چہروں کے پیچھے بھی ہے کیا کچھ
اتنی سی عطا وہ مجھے بینائی تو کر جائے

میں کر تو سکوں جُرمِ محبت کی وضاحت
پھر جو وہ سزا دے، مری شنوائی تو کر جائے

ہے فرض قتیلؔ اُس پہ مرا جان چھڑکنا
پر وہ مری کچھ حوصلہ افزائی تو کر جائے

عصبیّت

بکھری پڑی تھیں زمیں پر کچھ آوازیں
میری سماعت نے جن کو سمیٹا
اُن میں اِک آواز تھی ایسے کاہن کی
جو تمکنت سے خلا میں تھا لیٹا
میں کون ہوں کیا ہوں؟ پُوچھا نہ یہ اُس نے
مجھ کو بس اِک رَٹ میں اُس نے لپیٹا
تُجھ میں رواں ہے لہو کس قبیلے کا
تُو جس کا بیٹا ہے وہ کس کا بیٹا؟

جمہوریت

کہتے ہیں جس کو جذبۂ جمہوریت ، وہ پیڑ
تا زندگی کسی سے اکھاڑا نہ جائے گا
جس کی جڑیں عوام کے ذہنوں میں ہوں قبیل
وہ باغ آندھیوں سے اُجاڑا نہ جائے گا

گئے برس جو گیت سُنا تھا ہریالے ساون سے
وہی گیت مَیں سُننا چاہوں آج تری جھانجھن سے

پُورے چاند کی رات کو جب تُو میرے پاس نہیں تھی
اگنی بان برستے دیکھے مَیں نے کرن کرن سے

تیرے حوالے مَیں نہیں کرتا اِس لیے دِل اپنا
تجھے کھلونے توڑنے کی عادت سی ہے بچپن سے

یہ سب جادُو ہے البیلی تیرے سانولے پن کا
آتی ہے چندن کی خوشبُو تیرے مست بدن سے

کاہے چُھپ چُھپ کر بیٹھے تو میری کو بتاؤں میں
وہ سجنی کیا سجتی، جس کو آئے لاج سجن سے

ایسی بات نہ اب چھیڑوں گا جو ایسی ویسی ہو
پہلے ہی مَیں تجھے منا کر لایا لاکھ جتن سے

لاکھ قتیلؔ کہے جاؤ تم اِک سچے پریمی ہو
آدمی تو پہچانا جائے اپنے چال چلن سے

آنسو آنسو ہر قطرہ شبنم کا ہے
یہ منظر، یہ گریہ کس موسم کا ہے

پس منظر میں شور ہے کچھ زنجیروں کا
سامنے دھوکا پائل کی چھم چھم کا ہے

کچھ گونگوں نے چھیڑے گیت اُجالوں کے
اندھوں کی بستی پر سُورج چمکا ہے

مَیں نے دیا الزام تو چیخ اُٹھا شیطان
یار، یہ سارا کیا دھرا آدم کا ہے

باندھے وہ دستار جو سر بھی رکھتا ہو
قول یہ میرے اک سچّے ہمدم کا ہے

پتّھر جس کو سب کہتے ہیں یار قتیلؔ
پہلا نام وہ ایک حَسین صنم کا ہے

✺

جو خود اُس کا رستہ روکیں اُن کے آگے جھکتی ہے
ورنہ ہر دروازے پر تقدیر بھلا کب رُکتی ہے

میری گلی کے لُوٹنے والے شور مچاتے ہیں لیکن
تب امداد پہنچتی ہے جب بربادی ہو چکتی ہے

ساون تو ہے ایک مگر کیا کہیے اس دو رنگی کو
باہر پڑے پھوار تو اندر جان ہماری پھُکتی ہے

کبھی نہ دیکھی کسی نے اب تک نرمی بانجھ درختوں میں
جس ڈالی پر پھل آ جائے صرف وہ ڈالی جھکتی ہے

ایک ہی وہ بازار تھا جس میں یوسف بیچا گیا قتیلؔ
اپنے ہر بازار میں اب انسان کی قیمت چُکتی ہے

شناخت

مَیں نے اِک شعر سُنا
رُوح مِری جھوم گئی
دِل میں کھنک پیدا ہُوئی
سوچ نے انگڑائی لی

مَیں نے اس شعر کے خالق سے کہا :
اپنی تخلیق مِرے سایۂ تحسینِ ہُنر تک لے آ
تاکہ مَیں بھی تِری اُس پرورشِ لوح و قلم کے انداز
غور سے دیکھ سکوں

دیکھ کے اَوروں سے کہوں

آج مَیں نے بھی وہ آواز سُنی ہے جس میں
اِک چٹکتے ہوئے غنچے کی ادا شامل ہے
اِک چہکتے ہُوئے پنچھی کی صدا شامل ہے
اِک اُمڈتے ہُوئے بادل کی دُعا شامل ہے
—— اَور اس شعر کے خالق نے کہا :—

اے مرے قدر شناس
ساری دُنیا سے الگ یہ تری تحسین ہنر!
تُو کوئی صاحبِ اولاد نظر آتا ہے

سراپا غم ہیں اور وہ گُدگُدانا چاہتا ہے
زبردستی کوئی ہم کو ہنسانا چاہتا ہے

وہ رہبر، بھائی ہے جو ایک بحری جانور کا
ہماری لاش پر آنسو بہانا چاہتا ہے

کیا ہے جس نے پتھراؤ خُدا کا نام لے کر
وہ دُنیا میں کوئی نیکی کمانا چاہتا ہے
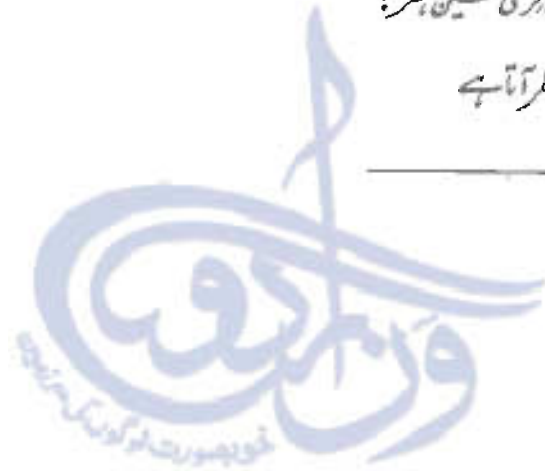
بہت زوروں پہ ہے دونوں طرف شوقِ شہادت
جسے دیکھو وہی جنّت میں جانا چاہتا ہے

کہو سب شہر والوں سے کہ اُس کے ساتھ ہو لیں
قتیلِ انسانیت کا گیت گانا چاہتا ہے

✺

وہ کھُل کر اب کوئی جلوہ دِکھانا چاہتا ہے
وہ کہتا ہے "اُسے سارا زمانہ چاہتا ہے"

خُدا شاہد، بُری نیّت نہیں رکھتا وہ قاتل
تماشا رقصِ بسمل کا دِکھانا چاہتا ہے

وہ زخم آئیں گے جن کے ساتھ اک مرہم بھی ہو گا
نئے تیروں سے وہ ترکش سجانا چاہتا ہے

یہ کہہ کر اک نیا پنجرہ بنا دیتا ہے صیاد
پرندہ خود، قفس کا آب و دانہ چاہتا ہے

قتیلؔ اُس کو ہماری بے گناہی سے غرض کیا
سزا دینے کا وہ کوئی بہانہ چاہتا ہے

افروایشیائی نغمہ

زنجیریں جب ٹُوٹیں گی جھنکار تو ہو گی
صدیوں کی سوئی دُنیا بیدار تو ہو گی

پھیلے ہُوئے اس دھرتی پر ہیں لوگ جہاں تک
پہنچے گی زنجیروں کی جھنکار وہاں تک
دُنیا جاگی تو کوئی محکوم نہ ہو گا
کوئی وطن آزادی سے محروم نہ ہو گا
چکنا چُور غلامی کی دیوار تو ہو گی
صدیوں کی سوئی دُنیا بیدار تو ہو گی

دُنیا بھر کے انسانوں کا یہی ہے کہنا
سب کا حق ہے امن اور چین سے زندہ رہنا
پاس نہ آنے دو نفرت کے طوفانوں کو
پیار کی آج ضرورت ہے سب انسانوں کو
پیار کی مٹی سے پیدا مہکار تو ہوگی
صدیوں کی سوئی دُنیا بیدار تو ہوگی

امن کے بادل اِک دن ہر سُو چھائیں گے
دھوپ کے بدلے ٹھنڈے سائے ملیں گے
پورب پچھم ہوگی آزادی کی رِم جھم
روکے گی جو قوم اسے کہلائے گی مُجرم
پت جھڑ میں بھی یہ دھرتی گلزار تو ہوگی
صدیوں کی سوئی دُنیا بیدار تو ہوگی

سینے میں حسرتوں کی جلن چاہتا نہیں
غم اب کوئی نیا مرا من چاہتا نہیں

وہ میرے شہرِ دل میں اگر آ بسا تو کیا
وہ کون ہے جو اپنا وطن چاہتا نہیں

انساں تھا وہ غموں نے فرشتہ بنا دیا
اب وہ تعلقاتِ بدن چاہتا نہیں

کہتے ہیں اُس کے حال پہ روتے ہیں دیوتا
جس سانوری کو اُس کا سجن چاہتا نہیں

ہونا ہو جس کو دفن خود اپنے ہی صبر میں
وہ چہرا آنسوؤں کا کفن چاہتا نہیں

اُس کو نہ پا کے جو اُسے رُسوا کریں قتیل
میں ایسے ظالموں کا چلن چاہتا نہیں

یارو، کہاں تک اور محبت نبھاؤں میں
دو مُجھ کو بد دُعا کہ اُسے بھول جاؤں میں

دل تو جلا گیا ہے وہ شعلہ سا آدمی
اب کس کو چھو کے ہاتھ بھی اپنا جلاؤں میں

سُنتا ہوں اب کسی سے وفا کر رہا ہے وہ
اے زندگی خوشی سے کہیں مر نہ جاؤں میں

اِک شب بھی وصل کی نہ مِرا ساتھ دے سکی
عہدِ فراق آ کہ تجھے آزماؤں میں

بدنام میرے قتل سے تنہا تو ہی نہ ہو
لا اپنی مُہر بھی سرِ محضر لگاؤں میں

اُترا ہے بام سے کوئی الہام کی طرح
جی چاہتا ہے ساری زمیں کو سجاؤں میں

اُس جیسا نام رکھ کے اگر آئے موت بھی
ہنس کر اُسے قتیل گلے سے لگاؤں میں

غُبار بیٹھ گیا

اپنے ماضی کے ناراض لمحات سے
یہ مری آج کی گفتگو ——
دل پہ رکھی ہوئی اِک گراں بار سِل توڑ کر
اور بھی کچھ مجھے مُنفعل کر گئی
وہ جو کچھ روح میں ہلکے ہلکے سے گرداب تھے
اُن کو بھی وہ مرے غم کے تالاب میں منتقل کر گئی
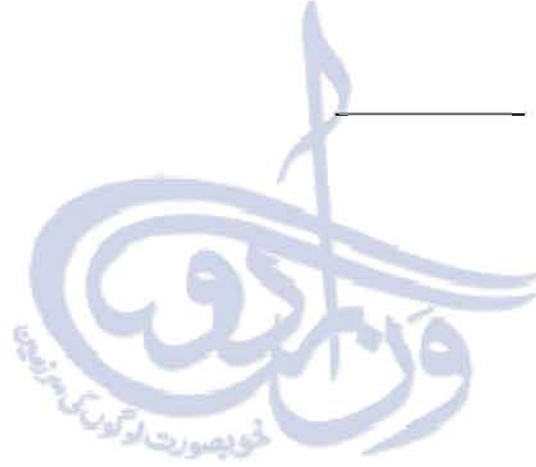
اور پھر اتنے اَن دیکھے آنسو بہائے مری آنکھ سے
تر بہ تر دامنِ جان و دِل کر گئی
لیکن اتنا ہُوا
شدّتِ درد کو
آج کی گفت گو معتدل کر گئی ——

❋

محبّت ہو رہی ہے تازہ دم آہستہ آہستہ
بڑھائیں آپ بھی آگے قدم آہستہ آہستہ

تھکے پاؤں بھی ہم تیرے شبستاں کے مسافر ہیں
پہنچ ہی جائیں گے منزل پہ ہم آہستہ آہستہ

ترا ملنا تو کیا، پیغام ہی نے کر دیا ثابت
خوشی آئے تو مِٹ جاتے ہیں غم آہستہ آہستہ

خود اُن کو ہم نے اپنے کعبۂ دل میں بسایا تھا
اب اس کعبے سے نکلیں گے صنم آہستہ آہستہ

ابھی تو وہ ہمارے شہرِ دل کے خاص مہماں ہیں
کھُلے گا حُسن والوں کا بھرم آہستہ آہستہ

بہت کم آس رکھنی چاہیے شادابیِ دل کی
برستا ہے یہاں ابرِ کرم آہستہ آہستہ

قتیلؔ انجام ہوتا کاش اپنا عاشقوں جیسا
کہ دَم دیتے کسی زانو پہ ہم آہستہ آہستہ

✺

ہَواؤں کی زبانی سُن لیا ہو گا ستاروں نے
سندیسہ جو تجھے بھیجا ترے فرقت کے ماروں نے

وہ آنکھیں جو وضاحت کے سبھی انداز رکھتی تھیں
یہ کیا ابہام پیدا کر دیا ان کے اشاروں نے

کہا اِک تجربے نے، دیکھ یہ ہوتی ہے مجبوری
گلے سے پتھروں کو جب لگایا آبشاروں نے

پہننے کو دِیا آخر لبادہ خشک پتّوں کا
خزاں کو ایک سوتیلی بہن سمجھا بہاروں نے

نظر آیا ہر اِک تصویر میں وہ آشنا چہرہ
رُلا ڈالا مصوّر ہم کو تیرے شاہکاروں نے

خُدا جس کی زباں سے بولتا تھا، وہ چڑھا سُولی
یہ نظارہ خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہزاروں نے

وہ دیتا ہے قتیلؔ اور بے خوشامد مُجھ کو دیتا ہے
خُدا میرا نہیں دیکھا ترے پروردگاروں نے

٭

وفا کا بوجھ ہے سر پر، مگر اُس کا یہ کہنا ہے
کہ یہ پتھر پگھل جانے تک اُس کو زندہ رہنا ہے

وہ پربت کا اِک ایسا پیڑ ہے جس نے زمستاں میں
بدن کے ڈھانپنے کو برف کا ملبوس پہنا ہے

وہ اِک سایا جو تحفے میں دیا تھا اُس کو خوابوں نے
وہی اب اُس کا آنچل ہے وہی اب اُس کا گہنا ہے

لکھا تھا ریت پر اِک دوسرے کا نام کیوں ہم نے
نتیجے میں جو صدمہ ہے وہ ہم دونوں کو سہنا ہے

ملیں گے سب یہاں جھوٹی خوشی پہنے ہُوئے، ورنہ
قریب آ کر جسے دیکھو وہ اندر سے برہنہ ہے

قتیلؔ ایسی بھی اِک عورت ہے اِس رِشتوں کی بستی میں
کہ جو ماں ہے نہ بیٹی ہے نہ بیوی ہے نہ بہنا ہے

کوکھ جلی

(احمد راہی مرحوم کی مختصر پنجابی نظم کا پھیلاؤ)

گاؤں سے باہر،
ٹیلے والی، اِک درویش کی قبر کے اوپر
آدھی رات کو
جھلمِل کپڑے، جگمگ زیور پہنے ہُوئے
وہ کون تھی دِیا جلانے والی
سب کچھ ہوتے جانے وہ کیا مانگ رہی تھی
رنگ رہی تھی کیوں اُجلا دوشالا اپنا کیسر میں
ہٹر ہٹر کیوں چاند کی جانب دیکھ رہی تھی

تکیہ اپنی چھاتی پر وہ کیوں رکھتی تھی
الگ وہ پتّوں کی اِک سیج بچھاتی کیوں تھی
سیج پہ لیٹی کُہنی کے بل
اپنے آپ سے کیوں وہ باتیں کرتی تھی
اور پھر باتوں باتوں میں
وہ برہم کیوں ہو جاتی تھی
سب کچھ ہوتے چاہتی کیا تھی
جھلمل کپڑوں، جگمگ زیوروں والی
اِک درویش کی قبر کے اُوپر
دیئے جلانے جاتی کیوں تھی؟

✵

جیسا اس کے لیے سُنا تھا ویسا ہے
مَیں نے برسوں بعد اُسے اب دیکھا ہے

ہر منظر کا ہوتا ہے اِک پسِ منظر
وہ لاکھوں میں ایک ہے لیکن تنہا ہے

مَیں دریا بن جاؤں بھی تو کیا حاصل
وہ ہے سمندر اور صدیوں کا پیاسا ہے

گیا تھا جب وہ اُس دن آگ بگولا تھا
واپس آیا ہے تو برف کا پُتلا ہے

پھر ماضی کو چُوما اُس کے ہونٹوں نے
پھر اِک لفظ مرے کانوں میں رویا ہے

میلہ لگا ہے چار طرف سنّاٹوں کا
کہیں کہیں کوئی سایا سِسکی لیتا ہے

کانچ کا ہر جذبہ پیچھے ہم چھوڑ آئے
اب تو اپنا پکّی عمر کا رشتہ ہے

مُجھ کو اپنے حال پہ آئے رحم قتیلؔ
مَیں نے اِک پنچھی کو اُڑتے دیکھا ہے

گُزرا ہے بیگانہ بن کر کیسا وہ
کبھی نہیں تھا آج سے پہلے ایسا وہ

اندر اندر ٹُوٹا سا اِک پیمانہ
باہر باہر لال گلابی مَے سا وہ

مَیں نے جھانک کے دیکھا اُس کی آنکھوں میں
وہ لگتا ہے جیسا نہیں تھا ویسا وہ

چوٹ لگی ہے شاید اُس کے بھی دل پر
آج دکھائی دیتا ہے مجھ جیسا وہ

میرا اور اصول ہے اُس کا اور قتیلؔ
پیار ہی پیار ہوں مَیں، پیسہ ہی پیسہ وہ

✷

لے گیا اپنی سب ریکھائیں اپنے ساتھ
دروازے پر دستک دینے والا ہاتھ

آپ سنبھل جائے گا ٹھوکر کھانے پر
دل کو مَیں سمجھاؤں میری کیا اوقات

یاد نہ وہ آئے تو آنکھیں کیا برسیں
جب چھائے گا بادل تب ہوگی برسات

حرف لکھے تھے جتنے وہ سب پھیل گئے
کاغذ کے دشمن ہوتے ہیں گیلے ہاتھ

مستقبل تو مستقبل ہی رہتا ہے
یوں لگتا ہے کبھی نہ بدلیں گے حالات

تھا مُجھ پہ بھی تنگ مرا گھر اس پر بھی
تنہائی نے رہنا چاہا میرے ساتھ

مَیں نے تو دو چار الزام خریدے تھے
دل کے شہر سے تم کیا لائے ہو سوغات

ساری رات مسلسل جاگنے والے نے
آنکھوں میں کچھ خواب سجائے پچھلی رات

یہ قصّہ اپنی تاریخ کا حصّہ ہے
کھا گئے ہاتھی چند ابابیلوں سے مات

مانگے سے گر ملے قتیلؔ محبّت بھی
ایک طرح سے ہوتی ہے وہ بھی خیرات

سِلسلہ خیالوں کا

جن کے تنکے تک مُجھ کو پہچانتے ہیں
یاد مجھے وہ تیری گلیاں آج بھی ہیں
جن کو حاصل رہا سدا رتجگا کوئی
میرے ذہن میں وہ رنگ رلیاں آج بھی ہیں
آج بھی مَیں سوچُوں تو ایسا لگتا ہے
ہونٹ ترے مصری کی ڈلیاں آج بھی ہیں

جب مَیں بیتے وقت کی باتیں کرتا ہُوں
کچھ مرجھائے پھُول مہکنے لگتے ہیں
کہوں ترے پس منظر میں جب کوئی غزل
بہت پُرانے جام کھنکنے لگتے ہیں
اب بھی گنتا ہُوں جب نام رقیبوں کے
لوگ مجھے حیرت سے تکنے لگتے ہیں

چُومتا ہُوں مَیں اُن پَیروں کو سپنوں میں
جن پَیروں میں روشنیوں کی جھانجھن ہے
رات کو اکثر آنکھیں ڈھانپ کے سوتا ہُوں
جگمگ جگمگ یوں بھی میرا تن من ہے
کیا لینا مجھ کو اِن چاند ستاروں سے
میرے اندر تو اِک سورج روشن ہے

بھڑکاتی ہے جس کو یاد جوانی کی
دیر تلک وہ شعلہ سرد نہیں ہوتا
موسم کیسا بھی ہو خون چمکتا ہے
عمر کوئی ہو چہرہ زرد نہیں ہوتا
یاد نہ رکھے جو اقرار وفاؤں کے
وہ سب کچھ ہوتا ہے مرد نہیں ہوتا

عمر کے جس رستے پر مَیں نے پاؤں دھرے
میرے جسم کے ساتھ چلا ہے جسم ترا
پکڑے رہا مَیں وقت کی اُنگلی جہاں تلک
پل پل مجھ پر چھایا رہا طِلسم ترا
رستہ روکیں جب حالات کے اندھیارے
روشنیاں دیتا ہے مجھ کو اِسم ترا

ٹوٹے گی دیوار

کچھ روز سے زنداں نظر آتی ہے یہ دُنیا
اب کچھ تو یہاں اہلِ نظر ہو کے رہے گا
اِنسان سمٹتا ہی چلا جائے کہاں تک
لگتا ہے کہ دیوار میں در ہو کے رہے گا

✷

اِک بار جو تک لے اُسے تکتا ہی چلا جائے
شعلہ سا بدن اُس کا دہکتا ہی چلا جائے

کردار ادا جب میں کروں بادِ صبا کا
وہ پھول کی مانند مہکتا ہی چلا جائے

حالات کی بجلی نے کیا راکھ نشیمن
پر آس کا پنچھی کہ چہکتا ہی چلا جائے

آجائیں میسّر جسے آنکھوں کے وہ ساغر
وہ رِند تو پی پی کے بہکتا ہی چلا جائے

پھُولوں کی توقع ہے نہ امکان ثمر کا
اِک پیڑ مگر پھر بھی لہکتا ہی چلا جائے

ہم لاکھ مہذّب ہوں مگر تم ہی بتاؤ
جب ضبط کا پیمانہ چھلکتا ہی چلا جائے

ہر گام پہ الزام قتیلؔ اب بھی ہیں لیکن
اُن پاؤں میں بچھوا جو چھنکتا ہی چلا جائے

٭

بے ذوق تھی یا حُسن سے آگاہ تھی پہلے
کیسی تری دُنیا مرے اللہ تھی پہلے

مَیں نے تو سُنا ہے کہ یہ دُنیا تری یارب!
شاعر کے خیالوں کی گزرگاہ تھی پہلے

کرنے کو ہے انسان خلاؤں کو بھی آباد
جو آج حقیقت ہے وُہ افواہ تھی پہلے

اب واعظ و ناصح جہاں کرتے ہیں عبادت
کہتے ہیں وہ اِک رِند کی درگاہ تھی پہلے

چھینا ہے مِرا جام اُن آنکھوں نے ، وگرنہ
اس چیز سے بچنے کی کہاں راہ تھی پہلے

تھا رشک رقیبوں کو مِرے حسنِ نظر پہ
اِک حُسن کی دیوی مِرے ہمراہ تھی پہلے

نزدیک سے دیکھا ہے قتیلؔ اب کے گھر اپنا
جنّت کی مِرے دِل میں بہت چاہ تھی پہلے

✻

صحراؤں میں اِک چھاؤں سی بکھراتی رہے گی
رُت کوئی بھی ہو ، زُلف وہ لہراتی رہے گی

تم چھین تو لو گے مِرے ساون کی گھٹائیں
آواز پپیہے کی مگر آتی رہے گی

جاتا رہا خوابوں میں خلل ڈالنے والا
اب دن میں بھی اکثر تمھیں نیند آتی رہے گی

بخشے گی نہ اُس کو کوئی سُورج کی عدالت
یہ رات ستاروں کی قسم کھاتی رہے گی

کچھ ضبط نہ کر پائیں گے عشّاق بھی تیرے
کچھ صورتِ حالات بھی جذباتی رہے گی

صحرا کو نہ چھوڑے گا کبھی شہر کی خاطر
دُنیا ترے دیوانے کو سمجھاتی رہے گی

تجھ پر بھی قتیلؔ آن پڑی جب کوئی اُفتاد
سب زندہ دِلی یار تری جاتی رہے گی

ڈرو اُس وقت سے

ڈرو اُس وقت سے
اے شاعرو، اے نغمہ خوانو، اے صنم سازو
اچانک جب تمھاری سمت
کچھ صدیوں پرانے شیش محلوں سے
سَناٹن تیر برسیں گے
بہت چلّاؤ گے تم

اور پکارو گے بہت باذوق دُنیا کو

مگر باذوق دُنیا کا ہر اِک باشندہ

پہلے ہی سے گھائل ہو چُکا ہوگا

جو باقی لوگ ہوں گے

وہ تمھارا ساتھ کب دیں گے

کہ وہ تو رجعتوں کی ہیروئن پینے کے عادی ہو چُکے ہوں گے

انھیں تو صرف وُہ باتیں بھلی معلوم ہوں گی

جہالت کا اندھیرا اور بھی ان کی رگوں میں جن سے بھر جائے

وہ باتیں ——

عقل و استدلال کا اِک شائبہ جن میں نہیں ہوتا

یہ مانا تم بہت سمجھاؤ گے اُن کو

مگر کوئی نہ سمجھے گا

اور اس دَورِ سیاہی میں

جو برپا کربلا ہوگی

وہاں کوئی بھی حُر پیدا نہیں ہوگا تمھاری پاسداری کو

ملیں گے سب تمھارے خون کے پیاسے

ڈرو اُس وقت سے

اے شاعرو، اے نغمہ خوانو، اے صنم سازو،

جو ممکن ہو تو بڑھ کر روک لو

اُس آنے والے وقت کا رستہ

معراجِ نظر

یاد آئے خالقِ حُسن و جمال
کوئی چہرہ خوبصورت دیکھ کر
زندگی سونا دکھائی دے ہمیں
صرف اِک مٹی کی مورت دیکھ کر

❋

اپنے لبوں کو دشمنِ اظہار مت بنا
سچے ہیں جو اُنھی کو گنہگار مت بنا

دِل کو دبا دبا کے نہ رکھ دھڑکنوں تلے
بے چینیوں کے لطف کو آزار مت بنا

جتنے بھی لفظ ہیں وہ مہکتے گُلاب ہیں
لہجے کے فرق سے اُنھیں تلوار مت بنا

ترکِ وفا کا جُرم نہ مانے گا تُو نہ مَیں
اس مسئلے کو باعثِ تکرار مت بنا

الزام کچھ تو گردشِ ایّام کو بھی دے
اپنے ہر ایک غم کو غمِ یار مت بنا

آ میرے بازوؤں میں کہ ساحل پہ جا لگیں
اِس مَوج مَوج وقت کو منجدھار مت بنا

تیرا یہ ضبط ، اور وہ شعلہ سا آدمی
سورج کے آگے موم کی دیوار مت بنا

شاید وہ تیرے مُنہ پہ ہی سچ بولنے لگے
چہرے کو آئینے کا پرستار مت بنا

ہر ایک کے لیے نہ کھُلا رکھ اسے قتیلؔ!
یہ دِل ہے ایک گھر اِسے بازار مت بنا

روکا ہے تُو نے جس کو سدا عرضِ حال سے
ہجرت وہ کر گیا ترے شہرِ وصال سے

وہ مر گیا جب اس کی سکونت بدل گئی
جیون سے بڑھ کے پیار تھا پنچھی کو ڈال سے

بندھوا رہا تھا جو مرے پاؤں میں بجلیاں
آگے بڑھا نہ خود وہ حدِ اعتدال سے

تھی ایسی بے خودی کہ جب آیا وہ سامنے
مفہوم گر گیا مرے دستِ سوال سے

تھا مَیں بھی حکمراں کبھی اقلیمِ حُسن پر
کُچھ لے سبق رقیب مرے ہی زوال سے

برسوں چلے قتیلؔ زمانے کے ساتھ ہم
واقف ہُوئے نہ پھر بھی زمانے کی چال سے

گریۂ مسرّت

احباب سے چُھپ چُھپ کے بھی رویا ہُوں میں اکثر
پر آج بھری بزم میں
رونے کا مزا اور ہی کچھ ہے

احباب کو حیرت، کہ مرے قہقہہ بردار لبوں پر
کیوں لے گئیں سبقت مری بھیگی ہُوئی پلکیں —
مرے تپتے ہُوئے آنسو

شاید مرے احباب کو معلوم نہیں ہے
اظہارِ مسرّت کبھی ہوتا ہے جو رو کر
سو بار کا ہنسنا بھی اُسے چھُو نہیں سکتا

آنسو ہیں وہ موتی
پلکوں کے صدف سے جو نکلتے ہیں اُسی دَم
جب دِل کے سمندر میں
خوشی کا کوئی طوفان بپا ہو
طوفان سما سکتا نہیں صرف ہنسی میں
آنسو ہی اُسے اپنی تراوٹ میں سمیٹیں تو سمیٹیں
آنسو کہ جسامت میں ہیں قطرے سے بھی کچھ کم
اظہارِ مسرّت میں سمندر سے بڑے ہیں

بے حِس مرے احباب ہیں
کاش اُن کو بتائے کوئی ہمدم
حاصل جو خوشی آج ہوئی ہے مرے دل کو
شاید وہ تبسّم میں سمیٹی ہی نہ جاتی
ہونٹوں پہ تبسّم بھی بہت خوب ہے لیکن
آنکھوں میں ترشّح کی فضا اور ہی کچھ ہے
برسات میں رم جھم کی صدا اور ہی کچھ ہے
اس بزم میں رونے کا مزا اور ہی کچھ ہے

آخر وہ میرے قد کی بھی حد سے گزر گیا
کل شام مَیں تو اپنے ہی سائے سے ڈر گیا

مُٹھی میں بند کیا ہُوا بچّوں کے کھیل میں
جگنو کے ساتھ اُس کا اُجالا بھی مر گیا

کچھ ہی برس کے بعد تو اُس سے ملا تھا مَیں
دیکھا جو میرا عکس تو آئینہ ڈر گیا

ایسا نہیں کہ غم نے بڑھا لی ہو اپنی عمر
موسمِ خوشی کا وقت سے پہلے گزر گیا

لکھنا مرے مزار کے کتبے پہ یہ حروف
مرحوم زندگی کی حراست میں مرگیا

❋

کچھ راحتوں کی کھوج میں آئی تھی زندگی
دیکھا تو اک لحد میں سمائی تھی زندگی

کیا کیا نہ ایک شخص نے رکھی سنبھال کر
معلوم اب ہوا کہ پرائی تھی زندگی

ہو جائے ریزہ ریزہ لگے جب ذرا سی ٹھیس
کیا سوچ کر خدا نے بنائی تھی زندگی

تھا دشمنوں کے واسطے عبرت کا یہ مقام
کاندھے پہ دوستوں نے اٹھائی تھی زندگی

واپس گئی عدم کی طرف خاک اوڑھ کر
سانسیں پہن کے دہر میں آئی تھی زندگی

اُڑتا ہُوا وہ ایک پرندہ ہے اب کہاں
اپنے پروں پہ جس نے سجائی تھی زندگی

دیکھا قمارِ خانۂ ہستی میں جب قتیلؔ
داؤ پہ ہر بشر نے لگائی تھی زندگی

——— (ڈاکٹر یوسف کی رحلت پر)

اِقراء

پیمبر سے کہا جبریل نے:
اِقراء
پیمبر نے کہا:
مَیں پڑھ نہیں سکتا
مگر اُس لمحۂ نور و تجلّی کا نتیجہ تھا
کہ اِک اُمّی وہ عالم بن گیا
رُوئے زمیں پر جس سے بڑھ کر
کوئی بھی علم و بصیرت کا نہ مالک تھا—
یہیں تک ختم ہو جاتا نہیں یہ سلسلہ علم و بصیرت کا
پیمبر کے غلاموں تک نے پائی روشنی
عِلم و بصیرت کی
اُجالا ہو گیا مشرق سے مغرب تک

کہا میرے زمانے سے گزرتے وقت نے

اِقرار

کہا میرے زمانے نے
مجھے پڑھنا تو آتا ہے
مگر مَیں بھُول جانا چاہتا ہُوں سارے لفظوں کو
اور ان لفظوں میں پوشیدہ ہر اک علم و بصیرت کو
کتابیں غرقِ دریا کرکے اطمینان و راحت چاہتا ہُوں مَیں
کہ اب ایسا ہی کرنا چاہیے مُجھ کو
گزرتے وقت نے پُوچھا بھلا کیوں؟
کہا —— علم و بصیرت اور کتب خانے مرے کس کام کے
جب ہر چوراہے پر
بلند آواز لاؤڈ اسپیکروں سے وہ بھی کچھ نشر ہوتا ہے
نفی ہوتی چلی جاتی ہے جس سے دم بدم علم و بصیرت کی
—— پھر اس کے ساتھ، سچّی بات تو یہ ہے
نہ مَیں کوئی پیمبر ہُوں، نہ تُو کوئی فرشتہ ہے
مَیں تیری بات کیوں مانوں —— ؟

❋

ہَوا کی لہر کوئی چھُو کے میرے یار سے آئی
کوئی تازہ خبر یوں بھی سمندر پار سے آئی

لبوں سے کم اور آنکھوں سے بہت کرتا ہے وہ باتیں
بلاغت اس میں یہ پابندیِ اظہار سے آئی

وہ اس کی گفتگو، کلیاں چٹکنے کی صدا جیسے
یہ نرمی اس کے لہجے میں ہمارے پیار سے آئی

کشش رکھتا نہیں اب پھُول میرے واسطے کوئی
کہ مُجھ تک ہر مہک، اُس زلفِ خوشبودار سے آئی

یہاں ہے جو بھی یوسف، خود زلیخاؤں کا گاہک ہے
روایت یہ نئی کیا جانے کس بازار سے آئی

وہ اِک مغرور سی لڑکی، خوشی جس کا تخلّص ہے
مرے پاس آ گئی لیکن بڑے اصرار سے آئی

اندھیروں نے قتیلؔ اکثر اُسی دیوار سے جھانکا
اُتر کر دھوپ میرے گھر میں جس دیوار سے آئی

وہ ساون جس میں زلفوں کی گھٹا چھائی نہیں ہوتی
جو برسے بھی تو سیراب اپنی تنہائی نہیں ہوتی

جنابِ عشق کرتے ہیں کرم کچھ خاص لوگوں پر
ہر انساں کے مقدّر میں تو رسوائی نہیں ہوتی

سمندر پُرسکوں ہے اس لیے گہرا بھی ہے، ورنہ
مچلتی ندیوں میں کوئی گہرائی نہیں ہوتی

یہ واعظ ہے، نہیں تقریر میں رکھتا جواب اپنا
مگر اس شخص کی باتوں میں سچّائی نہیں ہوتی

جہاں ساقی کے ایما پر کوئی کم ظرف آ بیٹھے
وہاں خوش ذوق رندوں کی پذیرائی نہیں ہوتی

کبھی چہرے بدل کر بھی یہاں کچھ لوگ آتے ہیں
کبھی کچھ دیکھتی آنکھوں میں بینائی نہیں ہوتی

قتیلؔ اکثر یہ دیکھا ہے کسی مفلس کے آنگن میں
برات آئے تو اس کے ساتھ شہنائی نہیں ہوتی

قتیلؔ اُس شخص کا کیا واسطہ میرے قبیلے سے!
وفا کے جرم میں جس نے سزا پائی نہیں ہوتی

معجزہ

بشر کے رُوپ میں اک دلرُبا طلسم بنے
شفق میں دُھوپ ملائیں تو اُس کا جسم بنے
وہ معجزات کی حد تک پہنچ گیا ہے قتیلؔ
حروف کوئی بھی لکھوں اُسی کا اسم بنے

کششِ جمال

قدم قدم پہ کئی خوش جمال ہیں لیکن
کسی میں بات کہاں میرے مہ جبیں جیسی
نگاہ جو بھی اُٹھے اس کے خال وخد پہ گرے
کشش ضرور کوئی اس میں ہے زمیں جیسی

✻

دل لگا بیٹھا ہُوں لاہور کے ہنگاموں سے
پیار ہے پھر بھی ہری پور، تری شاموں سے

کبھی آندھی کبھی شعلہ، کبھی نغمہ، کبھی رنگ
اپنا ماضی مجھے یاد آئے کئی ناموں سے

ایک وہ دن کہ بناں دید تڑپ جاتے تھے
ایک یہ دن کہ بہل جاتے ہیں پیغاموں سے

جب مرے ہاتھ پہ کانٹوں نے دیا تھا بوسہ
وہ مرا پہلا تعارف تھا گُل انداموں سے
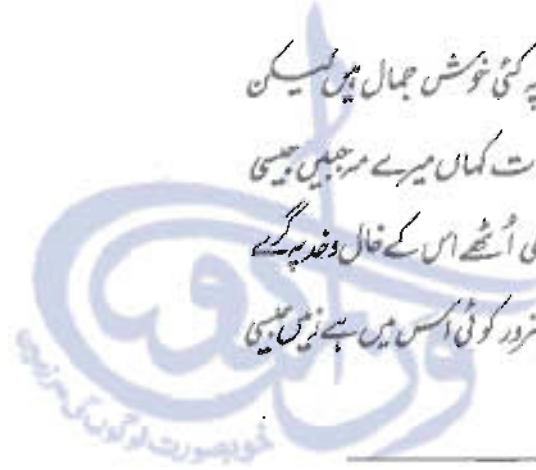
جان و دل دے کے محبت کے خریدار بنے
یہ کھری چیز تو ملتی ہے کھرے داموں سے

چور بازار میں بکنے نہ پہنچ جائے کہیں
جنسِ ایماں کو نکلوائیے گوداموں سے

پیروی حضرتِ غالب کی ہُوئی نصف قتیلؔ
مَے تو ملتی نہیں رغبت ہے فقط آموں سے

جب کبھی جام کو ہونٹوں سے لگایا مَیں نے
رقص کرتا ہُوا دیکھا ترا سایا مَیں نے

مجھ سے مت پُوچھ مرے محتسبِ شہر سے پوچھ
کیوں تری آنکھ کو پیمانہ بنایا مَیں نے

لوگ کہتے ہیں قصیدہ وہ ترے حُسن کا تھا
عام سا گیت جو محفل میں سُنایا مَیں نے

مے کدہ بند تھا لیکن جونہی گرجا بادل
اپنی توبہ کو چٹختا ہُوا پایا مَیں نے

شعر و نغمات کا رشتہ کبھی ٹُوٹا نہ قتیلؔ
جب غزل بن کے وہ آیا اُسے گایا مَیں نے

جب سے آیا ہے ترے پیار کا موسم جاناں
دِل میں رہتی ہے لگاتار چھما چھم جاناں

زخم جو تم نے دِیے اُن کا سندیسہ یہ ہے
بھیجنا اب نہ خدارا کوئی مرہم جاناں

جل رہے تھے مری پلکوں پہ جو یادوں کے چراغ
اب تو اُن کی بھی لویں ہو گئیں مدھم جاناں

رُک گئی سانس، بچھڑنے کی گھڑی جب آئی
دل مگر پھر بھی دھڑکتا رہا پیہم جاناں

باندھ لوں مَیں بھی تری یاد کے گھنگھرو لیکن
رقص کرنا بھی تڑپنے سے نہیں کم جاناں

تُو نے چھوڑا نہ کِسی ردِّ عمل کے قابل
اب مرا شعر، نہ شعلہ ہے نہ شبنم جاناں

جانے کیا تجھ سے ہُوئی بات کہ گُم صُم ہے قتیلؔ
اب ترا نام بھی لیتا ہے وہ کم کم جاناں

اب اَور تب

کہا اُس نے ——
مجھے تب واقعی تم سے محبّت تھی
کہا مَیں نے ——
مجھے تو آج بھی تم سے محبّت ہے
وہ تب کی بات کرتی ہے
مَیں اب کی بات کرتا ہُوں
مگر جو فاصلہ تب اور اب کے درمیاں حائل ہے
وہ ہم سے تو مل کر بھی سمیٹا جا نہیں سکتا
وہ اب تک آ نہیں سکتی
مَیں تب کو پا نہیں سکتا

خود فریبی

ہے بیکار کی بحث یہ جھوٹے سچے کی
جیسے بھی ہو اپنی لاج بچا لینا
تیرے در پر دے نہ بہار اگر دستک
گملے میں کاغذ کے پھول سجا لینا

✺

دستِ عوام ہو کہ گریبانِ شہر یار
اس دَورِ ناسپاس میں دونوں ہیں بے وقار

وہ شور ہے کہ گیت اُبھرتا نہیں کوئی
یوں ساز بج رہے ہیں کہ گھایل ہے تار تار

آئی نظر اُفق پہ شفق سی کِھلی ہُوئی
دیکھا تو پڑ رہی تھی وہاں خُون کی پھوار

کانٹوں سے کیا شکایتِ بیگانگی کریں
پھُولوں نے خود ہی کھول دِیا رازِ نو بہار

اب دُور تک نہیں کسی آہٹ کی نغمگی
مایوس ہو چلی ہے مری شامِ انتظار

سر پر جو آ پڑی ہے تو ہنس کر نبھائیے
حالات پر نہیں ہے کسی کا بھی اختیار

کھائے ہیں وہ فریب محبّت کے نام پر
اب اپنے آپ پر بھی نہیں ہم کو اعتبار

تُو نے دیا فریب تو مَیں بھی رہا خموش
اے دوست مَیں بھی تیری طرح ہُوں گناہگار

شاید کچُھ اور بھی مَیں ترا ساتھ دے سکوں
اے زندگی کبھی تو پلٹ کر مجھے پُکار

کوئی کِسی کی بات سمجھتا نہیں قتیلؔ
مجھ کو اسی لیے تو ہے دیوانگی سے پیار

❋

جب سے لبوں پہ شورِ گلُو ناچنے لگا
شہروں میں ایک عالمِ ہُو ناچنے لگا

جذبات کی برات کچھ اس شان سے چلی
سڑکوں پہ تیرا میرا لہُو ناچنے لگا

کتنے مزے کی چیز ہے بہتا ہُوا لہُو
اس مَے سے بھر گیا تو سبُو ناچنے لگا

مَیں ناچتا ہُوں صرف تڑپنے کے شوق میں
اے دوست کِس خیال سے تُو ناچنے لگا

دھوکا ہُوا جو رقص پہ کارِ ثواب کا
شیخِ حرم بھی کر کے وضو ناچنے لگا

مَیں ذبح ہو گیا جو قتیل اپنے ہاتھ سے
خوش ہو کے اس خبر سے عدو ناچنے لگا

شہر آشوب

رشتۂ دیوار و دَر، تیرا بھی ہے، میرا بھی ہے
مت گرا اس کو یہ گھر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

تیرے میرے دَم سے ہی قائم ہیں اس کی رونقیں
میرے بھائی یہ نگر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

کیوں لڑیں آپس میں ہم ایک ایک سنگِ میل پر
اس میں نقصانِ سفر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

شاخ شاخ اس کی ہمیشہ بازوئے شفقت بنی
سایا سایا یہ شجر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

کھا گئی کل ناگہاں جن کو فسادوں کی صلیب
اُن میں اِک نُورِ نظر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

اپنی حالت پر نہیں تنہا کوئی بھی سوگوار
دامنِ دل تر بہ تر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

کچُھ تو ہم اپنے ضمیروں سے بھی کر لیں مشورہ
گرچہ رہبر معتبر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

غم تو یہ ہے گر گئی دستارِ عزت بھی قتیلؔ
ورنہ اِن کاندھوں پہ سر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

❋

ہر نئے سُورج کی رہ رہ کر پذیرائی کریں
ہم سمجھتے بوجھتے نقصانِ بینائی کریں

اس جگہ تقدیر لے آئی ترے بیمار کو
جس جگہ جلّاد بھی شغلِ مسیحائی کریں

نام تیرا ہم نے خود لکھا ہے جب ہر اینٹ پر
کس طرح مسمار ہم دیوارِ تنہائی کریں

پاس میرے آ گئے ہو جب تو پھر جلدی ہے کیا؟
آؤ کچُھ سپنے بُنیں کچُھ محفل آرائی کریں
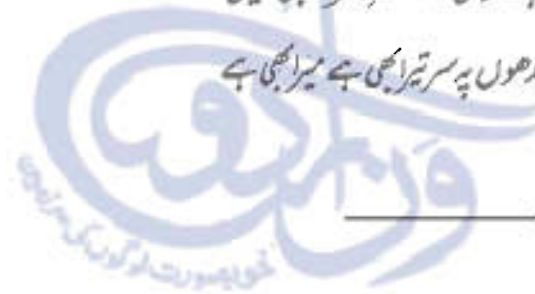
گو معاونِ عشق میں خلقِ خدا بھی ہے مگر
کیوں نہ ہم کچھ آپ بھی سامانِ رسوائی کریں

پھول جن لوگوں میں بانٹے ان کو لازم ہے قتیلؔ
پتھروں سے وہ ہماری عزت افزائی کریں

✻

کون کس کے ہاتھ آیا اور کھلونا ہو گیا؟
چھوڑیئے اِس بات کو جو بھی تھا ہونا ہو گیا

اُس کے کُوچے کی زمیں جس دن سے مَیں نے اوڑھ لی
آسماں اُس روز سے میرا بچھونا ہو گیا

دیکھ لوں تو دیر تک لیتی ہے چٹخارے نظر
ذائقہ اب اس کے چہرے کا سلونا ہو گیا

شام کے سُورج نے جب ترچھی شعاعیں ڈال دیں
اپنے سائے کے مقابل میں تو بونا ہو گیا

میری قیمت صرف پیتل کے برابر تھی قتیلؔ
چھُو کے اُس پارس بدن کو میں تو سونا ہو گیا

❋

اپنی اپنی سوچ کے صحراؤں میں
ہم بچھاتے ہیں بگولے پاؤں میں

جب سُنی ہم نے پپیہے کی صدا
جا بسے بیتی ہُوئی برکھاؤں میں

دِل کے دروازے پہ دستک سی ہُوئی
گھنٹیاں بجنے لگیں آشاؤں میں

خود ہی تھے موجود استقبال کو
ہم گئے جس شہر میں جس گاؤں میں

چاند تاروں میں کیا جس کو تلاش
وہ تھا میرے ہاتھ کی ریکھاؤں میں

ہم کھڑے تھے دو رُتوں کے درمیاں
دُھوپ میں وہ جل گیا میں چھاؤں میں

جا ملے دریا سمندر سے قتیلؔ
ندیاں گرتی رہیں دریاؤں میں

کیڑا، رزق اور پتّھر

تُو ہے تجسّس کا خُوگر تو پہلے
پربت سے پتّھر نکال
پتّھر کو توڑ اور پھر دیکھ اُس میں
کیڑا ہے اِک بے مثال
صدیوں سے پتّھر ہی مسکن ہے جس کا
اور اس کا یہ ہے کمال
پتّھر کے اندر وہ رہ کر ہمیشہ
پاتا ہے رزقِ حلال

لیکن جو پتھر سے آجائے باہر
جینا اُسے ہو محال
باہر کی دُنیا ___
مالِ حرام اور لالچ کی منڈی
سرمایہ داروں کی رنڈی
باہر کی دُنیا ___
اندر سے کالی
انسانیت کے لیے ایک گالی
اِس میں ہے خواب و خیال
اے دوست ___! رزقِ حلال

✺

وہ شخص جس کو مری زندگی میں آنا تھا
سُنا ہے اُس کے تعاقب میں اِک زمانہ تھا

نہ تھا پسند کسی کو بھی دِل کا دِل سے مِلاپ
مگر ہمیں تو دِیے سے دِیا جلانا تھا

نہ جانے بھیگ چلی کیوں ہماری پیشانی
ہمارے سر پہ تو سُورج کا شامیانہ تھا

بہت عروج پہ جب تھے ہمارے قول و قسم
ہمارے پیار کا وہ آخری زمانہ تھا

بہت قریب، بہت ہی قریب تھا صیاد
قفس سے دُور بہت دُور آشیانہ تھا

قتیلؔ تجھ کو ملی ہے اسی لیے شہرت
کہ تُو سماج کی تنقید کا نشانہ تھا

✱

نہ ولولے وہ رہے اور نہ وہ زمانہ رہا
سماں حیات کا لیکن سدا سہانا رہا

غزل حرام ہوئی، حُسن پہ لگے پہرے
مرا مزاج مگر پھر بھی شاعرانہ رہا

خُدا بھی مان لیا بندگی بھی کی اُس کی
تعلق اُس سے مگر اپنا غائبانہ رہا

لکھا ہُوا مرا ماضی تھا جس کے تنکوں پہ
مری اُڑان میں حائل وہ آشیانہ رہا

پروں کے ڈھیر لگے ہیں وہاں وہاں اب بھی
جہاں جہاں کسی پنچھی کا آشیانہ رہا

کہیں کہیں کوئی راحت، کہیں کہیں کوئی غم
مرے نصیب کا منظر وہی پرانا رہا

قتیلؔ ترکِ مراسم وہ کر گیا، پھر بھی
سلوک اُس کا مرے ساتھ دوستانہ رہا

اگرچہ بزم میں درد آشنا بھی کہتا ہے
کوئی نہ ہو تو مجھے وہ بُرا بھی کہتا ہے

مرے خُدا، اُسے جھٹلاؤں کس بہانے سے
وہ اجنبی تو مجھے آشنا بھی کہتا ہے

مَیں اس کے دوغلے پن سے بہت ہی عاجز ہُوں
وہ مجھ سے پیار کو اپنی خطا بھی کہتا ہے

ہُوا ہے اپنا تعارف اِک ایسے موسم سے
جو آندھیوں کو خرامِ صبا بھی کہتا ہے

نوادرات کی قیمت پہ جن کو بیچ سکے
زمانہ ایسے بُتوں کو خدا بھی کہتا ہے

قتیلؔ تُو کبھی واعظ کا اعتبار نہ کر
مذاق سے وہ تجھے پارسا بھی کہتا ہے

لفظوں کی بانبی کا سانپ

کب سے چند لبوں کے پیچھے
رینگ رہا ہے دھیرے دھیرے
لفظوں کی بانبی کا سانپ
یُوں لگتا ہے
چند لبوں سے آگے بڑھ کر
یہ زہریلا سانپ کئی ہونٹوں تک جانا چاہتا ہے
بتلاتی ہے کینچلی اِس کی
بنا ہُوا بارود کا ہے اس کا پیکر
جُھلسائے جو نظر نظر کو، بدن بدن کو
خطرہ جس سے ڈگر ڈگر کو، چمن چمن کو

خوف کے مارے آنکھ اٹھا کر کوئی نہ اس کی جانب دیکھے

لیکن تُو کیا واقعی اس کو دیکھنا چاہے ہے؟

بڑے شوق سے دیکھ!

لیکن تیرے لیے ہے بہتر

پہلے تو اپنی آنکھوں کو

ڈھانپ لے ٹھنڈے پانی کی عینک سے

اور کنکھیوں سے اس کے زہریلے پن کو بھانپ

تب تو ٹھیک سے جان سکے گا

کیسے تیرے پاؤں سے کُچلا جا سکتا ہے

لفظوں کی بانبی کا یہ زہریلا سانپ

✺

صرف ترے ہاتھوں کو چُوموں، تیری بیعت چاہوں

سو در چھوڑ کے تیری ایک حسین کرامت چاہوں

تھوڑے تھوڑے دن کاٹے ہیں کتنی ہی گلیوں میں

آخری بار ترے دل میں اے دوست سکونت چاہوں

آ میں کوئی ڈھنگ سکھاؤں تجھ کو بے چینی کا

تیرا دوست ہوں اپنی سی تیری بھی حالت چاہوں

تیرے ذہن کی چاندی اور تیرے جذبات کا سونا

اپنا جسم لُٹا کر بھی میں صرف یہ دولت چاہوں

اُوپر والا پوچھ ہی بیٹھے مُجھ سے تو مَیں بُزدل
تُجھ سے کُھل کر باتیں کر سکنے کی ہمّت چاہوں

بے غرضی کی آخری حد پر بنا قتیلؔ جو ساتھی
وہی تو ہے اِک شخص جسے مَیں بِناں ضرورت چاہوں

✺

چاند بھی راہ میں رُکیا ہے روشن پھر بھی کوئی نہ آیا
رات گئے حیران کھڑے ہیں مَیں اور میرا سایا

سنّاٹے کے رنگ ہیں لاکھوں کِس کِس کو پہچانوں
مَیں نے اِک پل چاپ سُنی اور برسوں دھوکا کھایا

دھوپ کا بھی اِک رُوپ ہے یارو گرم گلابی لیکن
اکثر ٹھنڈے جھونکوں سے بھی رنگ مرا سنولایا

روتا کیسا ؟ ڈھانپ کے مُنہ اب مَیں آہیں بھرتا ہُوں
ڈرتا ہُوں کہیں جاگ نہ جائے کوئی مرا ہمسایا

ہم بے داغ بدن والوں کو نیم برہنہ کر کے
ہر کوڑھی نے اپنے بدن پر اوڑھ لیا سرمایا

اپنے اپنے درد کے اندر چھُپ گئے ساتھی سارے
زخموں کے اس موسم میں کون اپنا کون پرایا

ساتھ ہمارا کبھی نہ چھوڑا یار قتیلؔ قلم نے
ورنہ اس دُنیا میں کس نے کس کا ساتھ نبھایا

خُون کی دستک

ناچے گا مرا دیوانہ پن
زنجیر پہن کر چھنن چھنن
اے دوست نہ رستہ روک مرا
اے دُنیا تُو دیوار نہ بن

آزاد ہُوا تھا مَیں پیدا اور مرنے تک آزاد ہُوں مَیں
اِنکار ہے جس کی فطرت میں اُس آدم کی اولاد ہُوں مَیں
شامل ہے مری مٹّی میں اگن
اے دوست نہ رستہ روک مرا
اے دُنیا تُو دیوار نہ بن

مجبوروں کا مَیں ہمدم ہُوں اور ساتھی ہُوں کمزوروں کا

مَیں ساتھ کبھی دے سکتا نہیں اِن کالے پیلے چوروں کا

یہ سب ہیں ترے میرے دُشمن

اے دوست نہ رستہ روک مرا

اے دُنیا تُو دیوار نہ بن

احساس کے موتی ہیں جس میں مَن ساگر کا وہ سیپ ہُوں مَیں

روشن جو اندھیرے گھر کر دے وہ جگمگ کرتا دیپ ہُوں مَیں

آزاد ہے میری کرن کرن

اے دوست نہ رستہ روک مرا

اے دُنیا تُو دیوار نہ بن

ظالم کو جس نے للکارا وہ شیر دِل جیسا مرد ہُوں مَیں

جن لوگوں پہ کوئی ظلم ہُوا ان لوگوں کا ہمدرد ہُوں مَیں

ہر ایک وطن ہے میرا وطن

اے دوست نہ رستہ روک مرا

اے دُنیا تو دیوار نہ بن

مَیں اپنے خُون کی دستک سے انسان کی آن جگاؤں گا

تم یہ نہ سمجھنا تیروں سے شمشیروں سے ڈر جاؤں گا

مَیں باندھ چُکا ہُوں سر پہ کفن

اے دوست نہ رستہ روک مرا

اے دُنیا تُو دیوار نہ بن

ناچے گا مرا دیوانہ پَن

زلزلے

دستکیں دے رہی ہے مشیّت

سونے والا مگر سو رہا ہے

کچھ تو مطلب ہے ان زلزلوں کا

کچھ تو زیرِ زمیں ہو رہا ہے

✺

اسیری کے نشاں سارے کے سارے بر محل رکھنا

جہاں چھنکی ہوں زنجیریں وہیں زلفوں کے بَل رکھنا

تمھیں بے کیف کرنے کو نہ جانے کب بدل جائیں

اُن آنکھوں کا تم اپنے پاس کچھ نعم البدل رکھنا

رہا ہے ربط میری شاعری کا اس کے ہونٹوں سے

مُکر جائے تو اُس کے سامنے میری غزل رکھنا
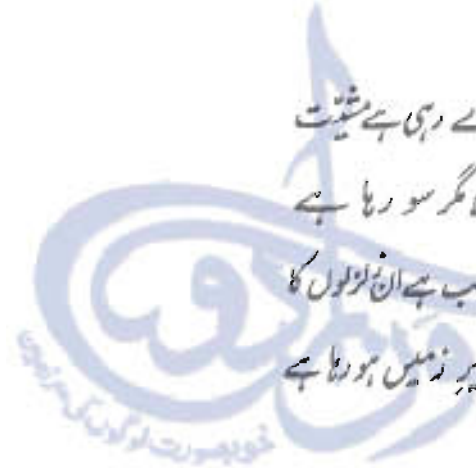
کبھی اپنی جفا پر وہ پشیماں ہو بھی سکتا ہے
مگر تم فیصلہ ترکِ محبّت کا اٹل رکھنا

ہزاروں آرزوؤں کو بسا بیٹھے ہو کیوں دل میں
نہیں آسان گھر میں اتنے مہماں آج کل رکھنا

ہواؤں سے بھی پڑ جاتے ہیں اکثر دائرے جس میں
قتیلؔ اُس جھیل میں ہولے سے یادوں کے کنول رکھنا

اگر چاہو تم اپنی حسرتوں کو تازہ دَم رکھنا
تمنّاؤں کی ہر وادی میں آہستہ قدم رکھنا

حسینوں کی وہ محفل ہو کہ دربارِ شہنشاہی
کہیں اچھا نہیں ہوتا سرِ تسلیم خَم رکھنا

دِلوں میں پیار ہے اپنا، دِلوں میں اس کا سراپا
عدُو کے سامنے یا رب تُو ہی میرا بھرم رکھنا

اُسے مَیں ڈھانپ لینا چاہتا ہُوں اپنی پلکوں میں
الٰہی اُس کے آنے تک مری آنکھوں میں دم رکھنا

یہی کچھ درمیانِ دین و دُنیا ہم نے دیکھا ہے
لگانا لَو خُدا سے اور پہلُو میں صنم رکھنا

قتیلؔ اب بھی مسیحائی کا دعویٰ ہے انھیں لیکن
کرم کی آس اپنے قاتلوں سے پھر بھی کم رکھنا

ایک انوکھی لڑکی

انگ ہے اُس کا پھُول سا، رنگ ہے لال گلال
دِل موہ لینے میں اُسے، حاصل بڑا کمال
ایک نظر میں کھینچ لے، جاتے راہیوں کو
جادُو اُس کی جھانجھنیں، مقناطیس جمال

ماتھا اجلے چاند سا، ہونٹ اس کے عنّاب
لڑکی ہنستی بولتی، جیسے کھِلا گُلاب
محبوبہ اُسے جان کے، پیش کیا جو پان
کہہ دے گی وہ آپ سے "بھیّا جی آداب"

کبھی سراسر مہر ہے، کبھی وہ قہر ہی قہر
وہ لڑکی کے رُوپ میں، کچھ امرت کچھ زہر
کوئی نہ سارے شہر میں، جانے اس کا نام
پھر بھی اُس بے نام کو، پہچانے سب شہر

✺

اُس کی زلف کے سائے سائے چلا کرو
جلتے لوگو ـــــ کچھ تو اپنا بھلا کرو

پیار کی آنچ نکھار کا باعث بنتی ہے
جلنا ہے تو پیار کی آگ میں جلا کرو

پیڑ یہاں کچھ سدا بہار بھی ہوتے ہیں
کوئی موسم ہو تم پھولا پھلا کرو

کوئی منظر پاؤں کی زنجیر نہیں
وادی وادی آزادی سے چلا کرو

جان بچاؤ تنگ نظر انسانوں سے
کچھ اپنا کچھ خلقِ خُدا کا بھلا کرو

پھندا جس کو پُورا، پھانسی چڑھے وہی
کس نے کہا تھا سامنے اپنا گلا کرو

غم کو اور بڑھاتی ہے یہ ہنسی قتیلؔ
چہرے پر یہ غازہ کم کم مَلا کرو

✺

اِس دھرتی کے شیش ناگ کا ڈنک بڑا زہریلا ہے
صدیاں گزریں آسمان کا رنگ ابھی تک نیلا ہے

مَیں ہُوں اپنے پیار پہ قائم اُن کی رسمیں وہ جانیں
اور ہے ذات حسینوں کی اور میرا اَور قبیلہ ہے

میرے اُس کے ہونٹ ہلیں تو کِھلیں ہزاروں پُھول مگر
کُچھ تو مَیں چُپ رہتا ہُوں کچھ یار مرا شرمیلا ہے

آنسُو ٹپکے ہوں گے اِن پر، حرف جبھی تو پھیل گئے
رویا ہے خط لکھنے والا، جبھی تو کاغذ گیلا ہے

مَیں نے کہا دو اجنبیوں کے دِل کیسے مِل جاتے ہیں
پیار سے بولی اِک دیوی یہ سب بھگوان کی لیلا ہے

یوں ہی تو نہیں کہتا رہتا نظمیں، غزلیں، گیت قتیلؔ
یہ تو کسی کی محفل تک جانے کا ایک وسیلہ ہے

٭

یوں لگتا ہے لاش ہماری موم کا پہنے ہُوئے کفن ہے
پھینکے گئے سمندر میں ہم پھر بھی اپنا خُشک بدن ہے

کیوں تالاب میں عکس ہمارا صاف نظر نہیں آتا لوگو
یا کچھ مسخ ہے چہرا اپنا، یا پانی میں گدلا پن ہے

کون سا بدلہ ہم سے لینے بھیجی گئی برسات فلک سے
کہاں سے بچ کر گزرے کوئی ساری گلیوں میں پھسلن ہے

رب کو خوش کرنے کے بہانے کرے دل آزاری بندوں کی
اِک موذی بس اِسی کام میں بڑے خلوص کے ساتھ مگن ہے

اُسی کے گھر سے ہوگا برآمد لُٹا ہُوا سب مال ہمارا
ہم رہبر سمجھے تھے جس کو وہ اک پشتینی رہزن ہے

ہر بن باسی ہے خطرے میں جانا چاہیے ہر سیتا کو
جہاں کہیں ہے کوئی لنکا وہاں کا راج پتی راون ہے

کون بتائے کس ظالم نے آکر توڑ دیے سب جھولے
چُپ ہیں کوئلیں اور پپیے خوب قتیلؔ اب کے ساون ہے

مَیلی روشنیاں

سُن کر شور فضا میں تیز ہواؤں کا
چار طرف واویلا ہوتے دیکھا ہے
گرد اُڑاتی آندھی کے چُھو لینے سے
روشنیوں کو مَیلا ہوتے دیکھا ہے

دینِ بے وجود

تُو کئی بار ہُوا قتل مگر اے مرے دِل
ترے مرنے پہ یہ دُنیا کبھی روئی بھی نہیں
تیرا مذہب تو ہے بس مذہبِ انسانیت
اور اس نام کا مذہب یہاں کوئی بھی نہیں

✻

کچھ ذی ہُنر جو بے ہُنروں کی طرح جیے
اپنے ہی گھر میں در بہ دروں کی طرح جیے

انساں کو چاہیے کہ مسافر نواز ہو
جتنا جیے ہرے شجروں کی طرح جیے

رکھے وہ اپنی آنکھوں پہ اپنا بریدہ سر
جو چاہتا ہو دیدہ وروں کی طرح جیے

جن کے سُروں میں کیف تھا اَوروں کے واسطے
ہم اُن اُداس نغمہ گروں کی طرح جیے

جُھکنا قتیلؔ ہم کو نہ آیا تمام عُمر
جب تک جیے کشیدہ سروں کی طرح جیے

✻

افشا بس اِک جھلک میں کہانی وہ کر گیا
اپنے بدن سے شعلہ بیانی وہ کر گیا

جھونکا لگا وہ مُجھ کو بسنتی ہواؤں کا
آیا تو میری شام سہانی وہ کر گیا

لکھ کر چلا گیا مِرے چہرے پہ اپنا غم
مُجھ کو عطا عجیب نشانی وہ کر گیا

سو جان دے کے بھی نہ کسی کو وفا ملے
دل کے نگر میں ایسی گرانی وہ کر گیا

اب اُس کی چال دیکھ کے بہتی ہیں ندّیاں
پابند پانیوں کی روانی وہ کرگیا

مُجھ سے انا پرست نے چاہا اُسے قتیلؔ
پتھّر کو اپنی آنچ سے پانی وہ کرگیا

رِدِّ نعمت

اونچے محل ہیں جس طرف جا کر وہاں یلغار کر
رِکن مِن برس، رِم جھم برس، چھاجوں برس، چھم چھم برس
لیکن مِرا کچّا مکاں شاید نہ تُجھ کو سہہ سکے
لِللہ اے ابرِ کرم! میری طرف کم کم برس

تحفّظ

جہاں میرے بھٹک جانے کا اندیشہ ہُوا پیدا
وہیں رستہ دکھایا دُودھ جیسی کچھ صداؤں نے
کوئی خطرہ قتیلؔ آیا جونہی مجھ پر جھپٹنے کو
مجھے اپنے پروں میں لے لیا ماں کی دُعاؤں نے

❋

غبارِ رہگزر جب پردۂ محمل پہ گرتا ہے
ہر اک ذرّہ کسی محمل نشیں کے دل پہ گرتا ہے

کسی پیاسے کو پانی جس طرح مل جائے صحرا میں
تھکا ہارا مسافر اس طرح منزل پہ گرتا ہے

اُڑاتی ہے مذاق اس کا بھنور کی حشر سامانی
کسی ملّاح کا پتوار جب ساحل پہ گرتا ہے

تجھے دے گا رعایت، اس غلط فہمی میں مت رہنا
عتاب اس کا جو گرتا ہے تو سب محفل پہ گرتا ہے
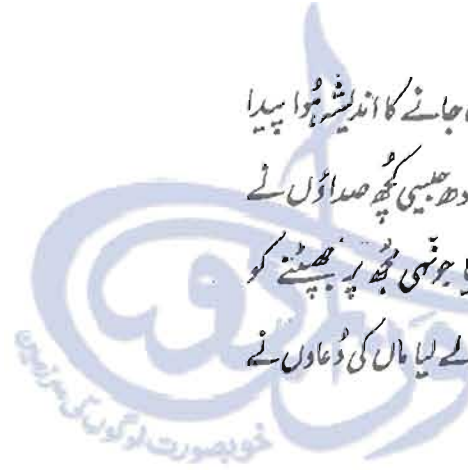
رعونت سے جسے پھینکا گیا ہو بے گناہوں پر
وہی خنجر پلٹ کر سینۂ قاتل پہ گرتا ہے

جو حیراں ہیں تمہارے ضبط پر کہہ دو قتیلؔ اُن سے
جو دامن پر نہیں گرتا، وُہ آنسو دل پہ گرتا ہے

☼

ضروری چیز جو مانگو وہی اکثر نہیں دیتا
وہ کرتا ہے عطا شرم و حیا، چادر نہیں دیتا

سگوں کو تو اجازت اس نے دی ہے کاٹ کھانے کی
حفاظت کے لیے ہم کو مگر پتھر نہیں دیتا

زمانے سے انوکھی دین ہے اس دینے والے کی
وہ دیتا ہے در و دیوار لیکن گھر نہیں دیتا

اکیلا حرف ہوں اور داستاں بننے کی حسرت ہے
مگر مجھ پر توجّہ وہ فسانہ گر نہیں دیتا

مجھے تو یوں لگے جیسے کفن پر ہے نظر اُس کی
مسیحا ہے تو کیوں مُردوں کو زندہ کر نہیں دیتا

سُنا ہے کھول بھی دیتا ہے وہ پنجرے کا دروازہ
مگر اڑنے لگیں پنچھی تو ان کو پَر نہیں دیتا

عنایت ہے قتیلؔ اس کی فقط کچھ خاص لوگوں پر
سخی وہ ہے تو پھر کیوں میرا دامن بھر نہیں دیتا

کہانی ختم ہُوئی

اپنی اکلوتی بہن بیگم اختر اورنگ زیب کے لیے
جو ۱۱۔مئی ۱۹۸۶ء کو اچانک مجھے تنہا چھوڑ گئیں

کھُلی جب آنکھ مری، اپنی ماں کے پہلو میں
تو پہلا باب کہانی کا ہو رہا تھا شروع
لبوں پہ حرف نکھرتے نہ تھے مگر پھر بھی
یہ آرزو تھی کہ ہو ایسی کوئی شکل طلوع
جو مُجھ کو اپنے خد و خال سے نہال کرے
جو میرے چہرے کو سونپے سب اپنے نقش و نگار
جسے میَں سونپ سکوں اپنا رنگ رُوپ تمام

کوئی اگر اُسے دیکھے تو مُجھ کو یاد کرے
سو ایسا ہو کے رہا ___

جب اس کی آنکھ کھُلی اپنی ماں کے پہلو میں
اِک اَور باب کہانی کا ہو گیا تھا شروع
جو ایک شکل نظر آئی ماں کے بعد اُسے
وہ میری شکل تھی
اور میری شکل میں شامل
اُسی کے نقش اُسی کا جمیل چہرا تھا
وہ میری شکل کے آئینے میں تھی محو ایسے
کہ جیسے میرے خد و خال اس کے دھیان میں تھے
وہ اپنی ذات مری ذات میں سموئے تھی
کہ میری آنکھوں میں جو اُس کا عکس تھا وہ بھی
مری ہی شکل میں تبدیل ہوتا جاتا تھا
وہ ماں کی گود سے مُجھ کو ہمک ہمک کے ملی
کہ جیسے میری تمناؤں کے سبھی سائے
پڑے ہوں صبحِ ازل اُس کے ہی خیالوں پر

اور اس نے میری تمام آرزوئیں
گھول کے گھُٹّی میں جیسے پی لی ہوں۔

کہانی آگے بڑھی
ایک باب اور کھُلا
مجھے اگر کوئی پتھّر لگا تو وہ تڑپی
اگر کبھی مرے ماحول نے ستایا مجھے
آنکھ اُس کی بھر آئی
اگر کہیں سے کوئی تیر مُجھ پہ پھینکا گیا
ڈھال اُس کے ہاتھ بنے
اگر کبھی مرے حالات مُجھ سے رُوٹھ گئے
جا کے وہ منا لائی
اگر کبھی مجھے شکوہ ہُوا زمانے سے
اُسی نے زندگیِ نَو کا حوصلہ بخشا
جو مسکراہٹیں مرے ہونٹوں پہ آ گئی ہیں کبھی
اُسی کی دین تھیں وہ
جو منزلیں مرے قدموں پہ مہرباں ہُوئیں

تو اُس کی راہبری کا کمال تھا یہ بھی
نماز اس لیے پڑھتی رہی کہ میرے لیے
دُعا کوئی نہ کوئی وہ خُدا سے مانگ سکے

کہانی آگے بڑھی
نکتۂ عروج آیا ـــــ
اِک ایسے وقت کو لے کر، کہ اس کی مشعلِ جاں
مرے لیے ہی نہیں جل رہی تھی سب کے لیے
وہ روشنی کی علامت تھی، زندگی کا نشاں
اُسے شعور تھا آدابِ آدمیت کا
وہ مسکراتے ہُوئے سب کے غم بٹاتی رہی
جو سب کو راہ دکھاتی رہی وہ میری بہن
اکیلی آج اِک ایسے سفر کو چل نکلی
جہاں سے لَوٹ کے آیا نہ کوئی آج تلک
کہانی ختم ہُوئی ـــــ

٭

چمک آتی ہے آنکھوں میں کبھی کچُھ سائے آتے ہیں
اُسے تو بات کرنے کے سبھی پیرائے آتے ہیں

خریدار اپنا ہو سکتا نہیں کمتر زلیخا سے
جبھی تو ہم سرِ بازار بن شرمائے آتے ہیں

ہمیں اب محفلِ خُوباں تلک آنے میں تامّل ہے
مگر جب وہ بُلا بھیجے تو سر نیہوڑائے آتے ہیں

ہماری خامشی نے کر دیا حساس لوگوں کو
لگے پتھر ہمیں تو جوش میں ہمسائے آتے ہیں

قتیلؔ اہل و عیال اپنے جنھیں فرصت نہیں دیتے
دکھی بہنوں کو اکثر یاد وہ ماں جائے آتے ہیں

٭

اگر وہ شخص خود چل کر تمھارے پاس آیا ہے
تو اُس کی جیب میں سرمایہ احساس آیا ہے

گیا تھا نوکری کرنے عرب کے تاجداروں کی
بڑے آرام سے وہ کاٹ کر بن باس آیا ہے

بنا سکتا تھا جو اپنے قلم سے دل کی تصویریں
وہ بن کر صرف اپنے جسم کا عکاس آیا ہے

غنیمت ہے کہ جاں دے کر ملی فرہاد کو شہرت
وگرنہ جذبۂ ایثار کس کو راس آیا ہے

قتیلؔ اب ساحلوں کی ریت بھی ہو جس کی مٹھی میں
سمجھ لینا وہ لے کر گوہر و الماس آیا ہے

ہوم سِک

(HOME SICK)

(سات سمندر پار کی ایک سوچ)

نہ اِس سے میری دُشمنی نہ اس سے مُجھ کو بَیر ہے
اِس ایک شہر میں ہزار جنّتوں کی سَیر ہے
مگر نہیں ——
دیارِ غیر پھر دیارِ غیر ہے

بڑے حسین زاویے کبھی تھے میری سوچ کے
مگر کسی نے رکھ دیا مرے پَروں کو نوچ کے
چلا تھا آسمان کو، زمیں پہ آ گرا ہُوں مَیں
جو ٹُوٹ کر بکھر گئے وہ خواب چُن رہا ہُوں مَیں
سُنا تھا اس دیار میں ہر آدمی کی خَیر ہے
مگر نہیں ——
دیارِ غیر پھر دیارِ غیر ہے

اگرچہ ہر طرف یہاں برس رہی ہے زندگی
وہ پیاس ہے کہ زہر کو ترس رہی ہے زندگی
یہ زندگی دُکھوں میں ہم گزارتے ہیں جس طرح
کرے ملول آدمی اسے قبول کس طرح
یہ ٹھیک ہے ملا ہُوا یہاں حرم سے دیر ہے
مگر نہیں —
دیارِ غیر پھر دیارِ غیر ہے

گھٹا گھٹا ہے دَم مرا، صبا کو ڈھونڈتا ہُوں مَیں
پھر اپنے دیس کی کُھلی فضا کو ڈھونڈتا ہُوں مَیں
قدم بڑھاؤں کس طرف کروں مَیں کس سے مشورہ
کہاں ہے میرا افریقا، کہاں ہے میرا ایشیا
یہاں تو اپنی زندگی سکون کے بغیر ہے
نہیں نہیں —
دیارِ غیر پھر دیارِ غیر ہے

❋

جو پُل صراط بناتے ہیں رہگزر کی جگہ
وہ دُھوپ لاکے نہ رکھ دیں کہیں شجر کی جگہ

ملاوٹوں کا بہت زور ہے مرے آقا
صدف سے ریت نکلتی ہے اب گُہر کی جگہ

کہاں سے مانگ کے لائیں وہ لوگ بینائی
ملا فریبِ نظر جن کو اِک نظر کی جگہ

وہاں جُھکایا گیا سر علوم و دانش کا
عیوب ہیں جہاں مسند نشیں ہُنر کی جگہ

جو بن بُلائے مسائل یہاں چلے آئے
پسند ہے مرا گھر اُن کو اپنے گھر کی جگہ

قتیلؔ تجھ کو ملے کیا وہاں پیامِ سحر
سکوت کا ہو تسلّط جہاں گجر کی طرح

❋

خموش رہ کے بھی آنکھوں سے بات کرتا ہے
وہ چاندنی کے تکلّم کو مات کرتا ہے

گلے ملے نہ ملے، کم مصافحہ بھی نہیں
معطّر اب بھی ہمیں اُس کا ہاتھ کرتا ہے

نبھا رہے ہیں کچھ ایسے ہم اُس سے یارانہ
عبور جیسے کوئی پُلِ صراط کرتا ہے

نہیں ہے کم کسی شب زندہ دار سے وہ شخص
بسر جو آنکھوں میں فرقت کی رات کرتا ہے

روانگی کی اجازت عطا کرے بھی تو عشق
ہزار تہمتیں عاشق کے ساتھ کرتا ہے

جو مہرباں ہو کسی پر کوئی حسیں قاتل
کہاں پسند وہ زہرِ حیات کرتا ہے

بہت سے نام تھے اُس کی بہت سی غزلوں میں
پر اب قتیلؔ ذرا احتیاط کرتا ہے

اِنتساب

ٹُوٹ بھی جائیں دُنیا بھر کے آئینے
کیا یہ گرگٹ جیسے رنگ بدلتے چہرے
بچ جائیں گے جھیلوں اور تالابوں سے؟

منزلِ مقصود

جلّادوں سے خوف آئے جس غیرت کو
وہ غیرت بازار میں جا کر چھوڑ آؤ
جن لفظوں کا حُسن قتیلؔ خوشامد ہو
انھیں کسی دربار میں جا کر چھوڑ آؤ

٭

شوقِ جلوہ ہے مگر ذوقِ نظر نابینا ہے
آئینے کے سامنے رکھا ہُوا آئینہ ہے

صرف اِک نظّارہ دے کر لے گیا آنکھیں کوئی
زندگی نے جو دِیا اُس سے زیادہ چھینا ہے

پیاس یوں بھڑکی مرے احساس ایندھن بن گیا
حسرتوں کی آگ سے روشن مرا اب سینہ ہے

اِن دنوں مَیں صبر کی دولت سے مالا مال ہُوں
یہ مِرا حق تھا اسے زخموں سے مَیں نے چھینا ہے

دُشمنوں کے ہاتھ آخر بِک گیا وہ بھی قتیلؔ
اِک چھُپا قاتل جو میرا ہمدمِ دیرینہ ہے

کر رہے تھے قریہ قریہ زندگی کی جستجو، مَیں اور تُو
ہو گئے آوارگی کے نام پر بے آبرو، مَیں اور تُو

تھے جہاں رسموں رواجوں کے اندھیروں پر فدا، اب اُس جگہ
معذرت بن کر کھڑے ہیں روشنی کے رُوبرُو، مَیں اور تُو

کچھ دنوں سے مَیں تری اور تُو مری مہمان ہے، کیا شان ہے
بن چُکے ہیں عکسِ جاں اِک دوسرے کا ہُو بہُو، مَیں اور تُو

آج کی ساری بہاریں آج کی ہر اِک خزاں نا مہرباں
رُت نئی کب آئے گی کب ہوں گے آخر سُرخرُو، مَیں اور تُو

کل بھی اپنی ذات میں ہم سرمد و منصور تھے، مسرُور تھے
کر رہے ہیں آج بھی ذوقِ انا کی آرزو، مَیں اور تُو

یہ ضروری تو نہیں حرف و صدا پُر زور ہو، اِک شور ہو
بند ہونٹوں سے بھی کرتے آ رہے ہیں گفتگو، مَیں اور تُو

اس گلستاں میں قتیلؔ اب نغمگی کے رازداں ہو گئے کہاں؟
دو ہی رہ جائیں گے باقی طائرانِ خوش گلو، مَیں اور تُو

❋

رُو برُو وہ ہے عبادت کر رہا ہُوں
اُس کے چہرے کی تلاوت کر رہا ہُوں

و خریدو اِک نظر کے مول مُجھ کو
اپنی قیمت میں رعایت کر رہا ہُوں

لی ہے صبر و ضبط نے مجھ سے اجازت
اپنے مہمانوں کو رُخصت کر رہا ہُوں

چھن گیا مُلکِ جوانی بھی تو کیا غم؟
اب بھی یادوں پہ حکومت کر رہا ہُوں

کوئی بھی غم اُس کو لوٹایا نہیں ہے
یوں امانت میں خیانت کر رہا ہُوں

اُس سے تو بس اِک ذرا سی بات چھیڑی
مَیں وضاحت پہ وضاحت کر رہا ہُوں

عشق کر کے آپ بھی بن جائیں انساں
شیخ صاحب کو نصیحت کر رہا ہُوں

عاشقی طوفانِ گریہ چاہتی ہے
اور مَیں آہوں پہ قناعت کر رہا ہُوں

آسماں جو شخص ہے سب کی نظر میں
اُس کو چھُو لینے کی جُرأت کر رہا ہُوں

مَیں نے دیکھا ہے قتیلؔ اُس کا سراپا
مَیں کہاں ذکرِ قیامت کر رہا ہُوں

فلیش بیک

FLASH BACK

بمبئی کی ایک شام
مَیں نے کی تھی جو کبھی
اِک دلرُبا دیوی کے نام

وہ شام یاد آنے لگی
دھڑکن مری گانے لگی
کھنکے مری یادوں کے جام

میں ذرا سا کھو گیا
جیسے نشہ سا ہو گیا
کرنے لگا خود سے کلام

شاعر تجھے کچھ یاد ہے
وہ بُت جہاں آباد ہے
اپنا وہاں جانا تھا عام

پر وہ زمانہ اب کہاں
رنگینیاں وہ سب کہاں
اُنگلی نہ اب یادوں کی تھام

تُو یاد کرتا ہے کسے؟
بھیجا نہیں تُو نے جسے
لاہور سے کوئی پیام

پر مجھ کو اُس پر بھی ہے شک
تُو کر رہا ہے آج تک
جس کے لیے نیندیں حرام

وہ مُورتی مرمر کی ہے
آخر تو وہ پتھر کی ہے
اُس کو بھی کیا اب تجھ سے کام

میں کیا کہوں کیسی ہے وُہ
جیسا ہے تُو ویسی ہے وُہ
دونوں مسافر بے مقام

مت جا پُرانے دَور میں
تُو بھی منا لاہور میں
اب بمبئی سی کوئی شام
افسانے کو دے اختتام

ہاتھیوں کا لشکر

چار سُو بڑھتے اندھیروں سے نہ ڈرا اے گُل زمیں
رات پھیلے گی تو قندیلیں بھی آئیں گی یہاں
ہاتھیوں کا ایک لشکر سامنے ہے بھی تو کیا
سنگ در منقار ابابیلیں بھی آئیں گی یہاں

✵

پیتا ہے خون اپنا، حالات کے مگوں میں
انگور دَوڑتا تھا، جس شخص کی رگوں میں

بے آب سے یہ چہرے، جذبوں سے ہیں جو عاری
کیا ڈھونڈتے ہو یارو، اِن کانچ کے نگوں میں

ہر چہرہ معتبر ہے، کِس کِس سے بچ کے چلیے
ہم گھر کے رہ گئے ہیں، اس شہر کے ٹھگوں میں

بیکار ہو چکے ہیں، انبار پتھروں کے
لوہے کی کھال جب سے، بانٹی گئی سگوں میں

کس کام کا قتیلؔ اب، یہ دوپہر کا سونا
برباد عُمر کر دی، تم نے تو رَتجگوں میں

✺

کیا حسین آنچ ہے مگر قریب جائے کون
اُس بدن کو چُھو کے اپنی اُنگلیاں جلائے کون

کھو گئے جو گیسوؤں کے ریشمی طلسم میں
اُن کو واپس اپنی اپنی چھاؤں میں بُلائے کون

کس کے عشق میں ہے دم کہ تاج اِک نیا بنے
اب دوبارہ پتھروں کو چاندنی پلائے کون

کس کے ہاتھ آ سکی ہیں بادلوں کی ٹولیاں
مُٹھیوں میں بند کر سکا ہے ان کے سائے کون

شہر میں عجیب سی خبر اُڑی ہے قتل کی
اُس گلی میں اپنی لاش دیکھنے کو جائے کون

جب نہ ہوگا ایک بھی مسافر اس زمین پر
تب چلائے گا بھلا یہ کارواں سرلٹے کون

سارے موسموں کی ہے تتیں جب خبر ہمیں
بجلیوں کے واسطے پھر آشیاں بنائے کون

دو عادتیں

مری دو عادتیں تھیں
ایک سگرٹ —— ایک محبوبہ
کہا احباب نے مجھ سے
کہ محبوبہ کو چھوڑا جا بھی سکتا ہے
مگر سگرٹ نہیں چھٹتا ——

کہا مَیں نے
کہ اے میرے جہاں دیدہ رفیقو، دوستو
سُن لو ——

تمھارے تجربوں سے معذرت کرتے ہُوئے
سگرٹ کو چھوڑا آج سے مَیں نے
مگر وہ میری محبوبہ ——؟
وہ اب دہرا سرُورِ زندگی دینے کو
سگرٹ کی طرح میرے لبوں کی لاج رکھے گی
نہ ہونے دے گی سگرٹ کی کمی محسوس وہ مجھ کو
—— مری اب ایک ہی عادت ہے
محبُوبہ ——

٭

ایک گُم صُم فضا کے سوا کُچھ نہ تھا میری چُپ چاپ حیرانیوں کے لیے
اب کے ساون میں بھی میں ترستا رہا گنگناتے ہُوئے پانیوں کے لیے

جب بھی نیکی بدی کا پڑا رَن کوئی، جو بھی ناصح تھا وہ پیٹھ دِکھلا گیا
سہہ گئے ہم ہی محرومیوں کے ستم، رہ گئے ہم ہی قربانیوں کے لیے

کیا خبر کیا خیال آیا صیّاد کو، اُس کے دل میں بھی اِک نرم گوشہ بنا
اب رہائی کے پیغام آنے لگے تیرے خوددار زندانیوں کے لیے

جھونپڑوں میں سسکتی ہوئی بیولو! ہوں گے خالی تمھارے لیے وہ محل
جو محل تاجداروں نے بنوائے ہیں اپنی پیاری مہارانیوں کے لیے

چاہے کوئی بھی ہو، کیوں خوشامد کریں، عاشقوں سے تو یہ کام ہوتا نہیں
کوئی شاعر ہی بُلوا لو دربار سے، گُل رُخوں کی ثناخوانیوں کے لیے

جوش پر ہے طبیعت قتیلؔ آجکل سامنے جو بھی آیا وہ بہہ جائے گا
یہ ندی اِک زمانے سے مشہور ہے اپنی مُنہ زور طغیانیوں کے لیے

باہر کی چمک بھی کیا کم تھی، پر بہت کچھ اس کے اندر تھا
یہ جان کے مَیں حیران ہُوا، ہر بوند میں ایک سمندر تھا

وا ہونا تھا جن ہونٹوں کو، اُن ہونٹوں پر اُنگلی رکھ دی
اِک شخص نے اس کو روک دیا، طوفان جو میرے اندر تھا

اپنے چہرے کو ترس گیا، جب شہر بسے عبرت کے
تھا ریزہ ریزہ آئینہ، اور خستہ حال سکندر تھا

عزّت بھی ملی شُہرت بھی ملی، پر اپنے آپ میں سمٹا رہا
نو دولتیوں کی دُنیا میں، اِک شخص قتیلؔ قلندر تھا

گونگے میرے شہر کے

کچھ روز پہلے تازہ ہُوا جن پہ تھی حرام
وہ بھی دِل و دماغ کے دَر کھولنے لگے
اپنے وطن کی صُورتِ حالات دیکھ کر
گونگے بھی میرے شہر کے اب بولنے لگے

مَیں خُدا سے کیا کہوں؟

حضرت عیسیٰؑ کو جب مصلوب کرنے آئے لوگ
تاج کانٹوں کا سجایا اُن کے سر پہ
پاؤں اور ہاتھوں میں کیلیں گاڑ دیں
کچھ نے تھوکا اُن کے مُنہ پہ
کچھ نے اُن کو گالیاں دیں
جب یہ سارے ظُلم اُن پہ ہو رہے تھے
آپ نے
آسماں کی سمت دیکھا اور کہا
اے خُدا ـــ!
تُو انھیں کر دے معاف

ان کو اتنا بھی نہیں معلوم
یہ کیا کر رہے ہیں۔

اور پھر صدیوں کے بعد
مَیں کہ صرف اِک شاعرِ معتوب ہُوں
عیسیٰؑ نہیں
ایک چورا ہے میں سب کے سامنے مصلوب ہُوں
میرے درپے بھی مرا ماحول ہے
میرے پاؤں اور ہاتھوں میں بھی کیلیں گڑ چکی ہیں
اور میرے مُنہ پہ تھُوکا جا رہا ہے
مُجھ کو بھی دی جا رہی ہیں گالیاں

آسماں کی سمت میں بھی دیکھتا ہُوں
دیکھتا ہُوں اور دل میں سوچتا ہُوں
مَیں خُدا سے کیا کہوں ---؟
مَیں کہ جو عیسیٰؑ نہیں

✺

شرمندہ انھیں اور بھی اے میرے خُدا کر
دستار جنھیں دی ہے انھیں سَر بھی عطا کر

لُوٹا ہے سدا جس نے ہمیں دوست بنا کر
ہم خوش ہیں اُسی شخص سے پھر ہاتھ مِلا کر

ڈر ہے کہ نہ لے جائے وہ ہم کو بھی چُرا کر
ہم لائے ہیں گھر میں جسے مہمان بنا کر

اِک مَوج دبے پاؤں تعاقب میں چلی آئی
ہم خوش تھے بہت ریت کی دیوار بنا کر

ہم چاہیں کہ رل جائیں ہمیں ڈھیر سے موتی
سیڑھی کسی بے نام سمندر میں لگا کر

درکار اُجالا ہے مگر سہمے ہُوئے ہیں
کر دے نہ اندھیرا کوئی بارود جلا کر

لے اُس نے ترا کاسۂ جاں توڑ ہی ڈالا
جا کُوچۂ قاتل میں قتیلؔ اور صدا کر

✺

چھائی ہوئی گھنگھور گھٹا ہے مرے سر پہ
پھر بارِ سبُو آن پڑا ہے مرے سر پہ

یہ گردِ مسافت ہے کہ منزل کا ہیولا؟
اب کون بتائے کہ یہ کیا ہے مرے سر پہ

گو بیت چُکا ہے وہ محبت کا زمانہ
تھوڑا سا مگر قرضِ وفا ہے مرے سر پہ

حاصل ہے محبّت مجھے اِک جانِ سخن کی
بیٹھا ہُوا کچھ دن سے ہما ہے میرے سر پہ

بے ساختہ یاد آیا ہے کوئی نہ کوئی دوست
پتھر کوئی جب آن لگا ہے مرے سر پہ

تم چاہو تو دستار بھی کہہ سکتے ہو اس کو
ورنہ یہ تکبّر کی سزا ہے مرے سر پر

بدلے گا سماں ، پھول بنیں گے مرے غنچے
اے دورِ خزاں ! دستِ صبا ہے مرے سر پہ

جائے گا قتیلؔ اب بھی خطا ، وارِ عدو کا
میں جانتا ہوں میرا خدا ہے مرے سر پہ

شانزے لیزے

—— پیرس کا خوبصورت مرکزی بازار ——

اجنبی او اجنبی —
سُن مری آواز سُن
دیکھ مجھ کو غور سے
شانزے لیزے ہوں میں
تُو نے اپنے دیس میں
نام تو میرا سُنا ہو گا ضرور
میں کہ اک بازار ہوں
خوبصورت باوقار
شہرِ پیرس کا سنگار

میری سڑکوں کے چمکتے پتھروں پر

آج تیرے پاؤں کس شائستگی سے پڑ رہے ہیں

کیوں کہ تُو شاعر ہے نازک دل کا مالک

اور شاعر ہی سمجھ سکتا ہے ہر دھرتی کے دُکھ کو

چاہے شاعر ہو کسی بھی دیس کا

تُو نے شاید سُن لیے ہوں گے وہ نوحے

جو رچے ہیں اب بھی میری خاک میں

جن میں چلّاتے ہیں

ماضی کے بھیانک چار سال

جب کہ ہٹلر اور اس کے چند جرنیلوں نے

میری خاک میں

بو دیے تھے آمریت کے سلاسل

تاکہ اُن سے

جَور و استبداد کی زہریلی سنگینیں اُگیں

اور میری خوشنما سڑکوں پہ چلتے راہرو

اپنے پَیروں میں کریں محسوس پابندی کے زخم

درد کی شدّت سے اُن کے ذہن، اُن کے حافظے

اپنی آزادی کی منزل بھول جائیں

اور پھر

سر جھکائیں آمریت کی سیہ دہلیز پر

غیر مُلکی فوجیوں کے بُوٹ جب روندیں

مری تہذیب، میرے امن کو

میری سڑکیں اس قدر چیخیں

کہ ان کے شور سے

امن و آزادی کے سارے گیت

چُپ ہو جائیں گونگوں کی طرح

لیکن اے میرے مسافر

میرے پیارے اجنبی

ایک دن ایسا بھی آیا

میری سڑکوں پر چمکتے پتھروں میں جاگ اٹھی بجلیوں سے

میری گلیوں میں بپھرتے شہریوں کی انتقامی قوتوں سے

میرے اُجڑے ریستورانوں میں دوبارہ زندہ ہوتی نغمگی سے

میری مٹی میں تڑپتے گرم جذبوں کی عقابی حدّتوں سے

میرے دریا "سین" کی بڑھتی ہُوئی طغیانیوں سے

سربلند "ایفل" کے معیارِ ہُنر سے

میرے گرجوں کے گجر سے

شہر کے ایک ایک گھر سے

اُٹھنے والی ایک سی آواز سے کھا کر شکست

جب غلامی کا ہر اِک ظالم پیامی

اپنے آمر اور جرنیلوں سمیت

اس طرح بکھرا کہ ذرّے بھی نہ بکھرے ہوں کبھی

اور اس دن ——

اک نئے سُورج نے یہ تحریر لکھ دی

اپنی کومل روشنی سے

اب کوئی آمر نہ آنے پائے گا

پیرس کے اس بازار تک

شانزے لیزے جسے کہتی ہے دُنیا

شانزے لیزے جسے جمہوریت سے پیار ہے

✳

روشنی چاہیے صبا کے لیے

پھول روشن کرو خُدا کے لیے

اُس کو اتنا بھی مہرباں نہ کہو

ہم ترس جائیں گے وفا کے لیے

عشق کی اِنتہا کسے معلوم

جان کافی ہے ابتدا کے لیے

بے گُناہی جو شرط ٹھہری ہے

ہم کو چُن لیجیے سزا کے لیے

پارسائی ہے بُزدلی کا نام
حوصلہ چاہیے خطا کے لیے

ہر کسی پر قتیل کیوں آتا
دِل تھا صرف ایک دِلرُبا کے لیے

✻

جسم کے جزیرے میں، یہ جو دل کی وادی ہے
اِس پہ راج ہے جس کا، تُو وہ شاہزادی ہے

اپنے در پہ سجدوں کی راہ کیا دکھا دی ہے
تُو نے میرے ماتھے پر زندگی سجا دی ہے

تُجھ کو بھُولنا چاہوں، اور شکست کھا جاؤں
کتنی بے وقار اپنی قوّتِ ارادی ہے

جستجو کے صحرا میں اب کہاں کوئی آنچل
مَیں نے اپنی چھاؤں بھی دھوپ میں گنوا دی ہے

یاد کر کبھی اسے تاج تُو بھی اُس محبّت کو
جس نے تیرے مرمر کو چاندنی پلا دی ہے

میرا ساتھ کیا دے گا شیخ برسرِ محفل
وہ تو چھپ کے بیچارہ جھومنے کا عادی ہے

دوست سب قتیلؔ اپنے تُل گئے رقابت پر
مَیں نے کوئی دل کی بات جب انھیں سُنا دی ہے

بے تعبیر

مَیں جب اپنی محبوبہ کے پیارے ہاتھ کو چُومتا ہُوں
اُس دن پہروں جھُومتا ہُوں
اور گماں ہوتا ہے مجُھ کو
میری طرح میری محبُوبہ
رات گئے سونے سے پہلے
اپنے ہاتھ کے اُس حصّے کو بڑے گھمنڈ سے چومتی ہو گی
جس کی نذر کیا ہوتا ہے مَیں نے بوسے کا نذرانہ
یہ نذرانہ اپنی سوچ میں گھول گھول کر

دھڑکن دھڑکن تول تول کر
ساری رات وہ جھومتی ہو گی
پاؤں زمیں پہ نہ لگتے ہوں گے
سوچ کی جنّت میں وہ جب جب گھومتی ہو گی۔

اُس کو ناز کہ پُوجے اُس کو
پاگل پن کی حد تک اُس کا ایک پُجاری
مُجھ کو اطمینان کہ مَیں نے
اُس کے نام پہ اپنی ساری عمر گُزاری

میری عقیدت اور اس کی بے مہر محبّت سدا جیے
طاری ہے جو ہم دونوں پہ
وہ کیفیت سدا جیے
سدا جیے وہ خواب جسے تعبیر سے نسبت کوئی نہیں

---

*

اے کاش تجھے ایسا اِک زخمِ جدائی دوں
جب ٹیس کوئی چمکے مَیں تجھ کو دِکھائی دوں

جس روز کبھی تیرا دیدار نہ ہو پائے
مَیں اپنی ہی آنکھوں کو نابینا دِکھائی دوں

مغرور ہے تُو کتنا صرف ایک صنم بن کر
تُو چاہے تو مَیں تجھ کو تن مَن کی خُدائی دوں

تجھ سا کوئی دِل والا محسوس کرے مُجھ کو
مَیں گیت نہیں ایسا جو سب کو سُنائی دوں

اِک عمر کے بعد اپنے چِت چور کو پکڑا ہے
مَیں کیسے قتیلؔ اس کو بانہوں سے رہائی دوں

دُنیا کو دکھانی ہے اِک شکل خیالوں کی
آؤ کہ بنائیں ہم تصویر اُجالوں کی

پَل بھر کو مرے گھر میں آئی جو پری اُڑ کر
کی اُس نے بسر مُجھ میں سو رات وصالوں کی

ہم دیتے چلے جائیں کس کس کا جواب آخر
رفتار نہیں گھٹتی دُنیا کے سوالوں کی

شاعر ہی تو دیتے ہیں تشبیہہ گھٹاؤں سے
ہم قدر بڑھاتے ہیں تم گیسوؤں والوں کی

اے دوست ادب اپنا پھر کیوں نہ ہو صحت مند
بنتی ہیں مری غزلیں خوراک رسالوں کی

بے چین قتیلؔ اُن بن ہم ہی تو نہیں تنہا
اُن کو بھی ضرورت ہے ہم چاہنے والوں کی

چاند، بُڑھیا اور پتھّر

اے طرب خانۂ مشرق سے اُبھرتے ہُوئے چاند
مَیں نے بچپن میں سُنا تھا کوئی بڑھیا تجھ میں
اَن گنت صدیوں سے بیٹھی ہُوئی چرخہ کاتے
اِس روایت سے بہت دیر نہ چھُوٹا دامن
بن گئی ایک حقیقت یہ ترے ہی ناتے

جب ذرا ہوش سنبھالا تو یہ سوچا مَیں نے
سُوت کے ڈھیر لگے ہوں گے تری وادی میں
سُوت — وہ جس سے بنا کرتا ہے مفلس کا لباس
ہو گا تقسیم کروڑوں کی اِس آبادی میں

لیکن اے چاند ترے شہر میں جب میں پہنچا
کوئی بُڑھیا تھی وہاں اور نہ چرخہ کوئی
سُوت پھر سُوت ہے پانی تھا وہاں اور نہ ہَوا
بے حسی اوڑھ کے سب تیری فضا تھی سوئی

منتظر تھے مری دھرتی کے برہنہ انساں
مَیں انھیں دوں گا ترے نور کے دھاگے لا کر
وہ بھی شرمندہ ہُوئے مجھ کو بھی شرمندہ کیا
مَیں نے لا پھینکے جب اُن لوگوں کے آگے پتّھر

رائیگاں جا نہیں سکتا تھا سفر میرا کبھی
چاند پر سُوت کا اِک تار بھی گر مل سکتا
یہ ندامت مرے حصّے میں نہ آئی ہوتی
پتّھروں سے کوئی ملبوس اگر سِل سکتا

اے طربِ خانۂ مشرق سے اُبھرتے ہُوئے چاند

❋

دن بھر ستانے کے لیے پیڑوں سے چھن کر آ گئی
میرے لیے اِک تیرگی سُورج پہن کر آ گئی

مَیں زندگی کی تلخیاں جب چھوڑ کر جانے لگا
وہ شکل میرے سامنے دیوار بن کر آ گئی

جو کچُھ مجھے بخشا گیا کم تھا بہت — روزِ ازل
حیرت کہ پھر میری انا کس طرح مَن کر آ گئی

چاہا کہ شہرِ حُسن میں اُونچی مری گردن رہے
میرے مقابل عمر کی شمشیر تن کر آ گئی

دوزخ تھی جس کی زندگی، جس کا کوئی بچّہ نہ تھا
شوہر کے گھر وہ بے نوا اِک سَوت بَن کر آ گئی

واقف نہیں کیا تُو قتیلؔ اِس پتھروں کے شہر سے
کیوں اِس میں تیری زندگی شیشہ پہن کر آ گئی

❋

یہاں ظُلم بندوں پہ جب ہو رہا تھا وہ کیوں چُپ رہا
مُجھے پُوچھنا ہے کہ وہ تو خُدا تھا وہ کیوں چُپ رہا

فلک تک نہ پہنچا اگر بے نواؤں کا نالہ کوئی
یہیں ایک طوفانِ آب و ہوا تھا وہ کیوں چُپ رہا

جو کمزور تھے اُن میں ہمت نہیں تھی کہ وہ بولتے
مگر روز منبر پہ جو چیختا تھا وہ کیوں چُپ رہا

اُسے اپنے جیسوں کی ایک ایک کرتوت معلوم تھی
ہمارا جو خود ساختہ رہنما تھا وہ کیوں چُپ رہا

نشانہ تشدد کا جب شہریوں کو بنایا گیا
جو اس شہر میں امن کا دیوتا تھا وہ کیوں چُپ رہا

عدالت میں جھوٹے گواہوں کی یلغار تھی کس لیے
جو ہر بات اچھی طرح جانتا تھا وہ کیوں چُپ رہا

سلیقہ نہیں عام اِنسان کو بولنے کا مگر
قتیلؔ ایک شاعر جو شعلہ نوا تھا وہ کیوں چُپ رہا

دوھا
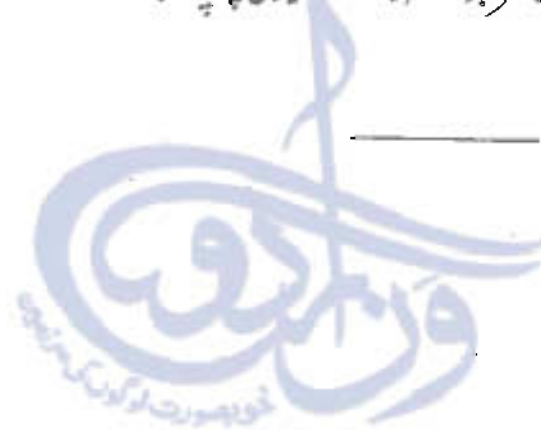
چلی جو نار ہزار بار، دھنک پہ رکھ کر پاؤں
اب کے پیر اُس نار کے، دیکھے بناں کھڑاؤں

مت آئیو تم شہر میں، بَن بَن ناچتے مور
عزت کے دُشمن سب یہاں کیا حاکم کیا چور

تُجھ بن ہو گئی ساجنا، مَیں کِتنی کنگال
چاندی بن کے رہ گئے، سونے جیسے بال

جانے کیونکر سہہ گئی، مَیں بِرہا کی آنچ
جلتی آگ کے سامنے، ثابت رہے نہ کانچ

پلکوں پیچھے جھومتے، اک گوری کے نین
آپ رہیں نت موج میں، ہمیں کریں بے چین

بھر بھر آہیں دُور سے، گوری کو مت چھیڑ
چلیں نہ جب تک آندھیاں، نہیں اُکھڑتے پیڑ

دِل کو دِل سے تول کے، جو کرتے ہیں پریت
قوم قبیلہ دیکھنا، نہیں ہے اُن کی ریت

وہ زردئی مزدور تھا، بھلے نہ تھا چنگیز
جس نے سمدھی سے لیا، پہلی بار جہیز

کہہ کے نہ آئے بالما، اُٹھے ہے من میں ہُوک
سُونا ہے مِرا آنگنا، کوئلیا مت کُوک

کاگا زور سے بولیو، میرے منڈیر سے آج
ساس نَنند کے سامنے، رکھیو میری لاج

جہاں نہیں من شانتی، جہاں نہیں تن گیان
گھر ہو یا بَن باس ہو، دونوں ایک سمان

سَتی تو مَیں ہو جاؤں گی، پر یہ مجھے بتا؛
پہلے اگر مَیں مر گئی، جلے گا تُو بھی کیا؛

پورب پچھم دُور دُور، راون کا ہے نام
سیتا جی سے پُوچھیے، رام ہیں پھر بھی رام

بھرے پُرے سنسار میں، جب بھی ملے اکانت
پیا پیا کے جاپ سے، مَن کو رکھیے شانت

کسی کی ٹُوٹیں چُوڑیاں، کسی کا بنے سہاگ
کبھی یہ دُنیا روگ ہے، کبھی یہ دُنیا راگ

سُکھ پائے یا دُکھ سہے، ہار ملے یا جیت
دھرم چکور کا پریت ہے، کرے گا چاند سے پریت

رہے کبھی نا ایک سا، گھٹتا بڑھتا چاند
پیار کا دیپک سدا جلے، پڑے کبھی نا ماند

پت جھڑ کہے بہار سے، پگلی یہ مت بھول
سدا نہ لہکیں ڈالیاں، سدا نہ مہکیں پھول

پتھر مارے پیڑ کو، جب کوئی کھیلن ہار
رُک جائے تب پیڑ پر، چڑیوں کی چہکار

جُڑا سا ہے ہر آدمی، اک دُوجے کے سنگ
الگ الگ سب صُورتیں، لہو کا ایک ہی رنگ

یُوں نینوں کو چین دے، اُس گوری کا رُوپ
جیسے چیت بساکھ کی، گرم گُلابی دُھوپ

اپنے ہی گھر سانوری، کاٹ رہی بن باس
رستہ مِلن کا روک لیں، کبھی ننند کبھی ساس

سُندر نار چمار کی، جس کا باپ اچھوت
چومے اُس کے پاؤں کو، پنڈت جی کا پُوت

یہ پیسہ کیا چیز ہے، کُھلے نہ اس کا بھید
جب آیا مرے ہاتھ میں، کرنے آیا چھید

کِتنے سُونے ہو گئے، اپنے چیت بساکھ
کبھی تھے آگ ہی آگ ہم، اب ہیں راکھ ہی راکھ

کبھی تو اے پرمیشور، کر پُوری مری آس
میں بھی لِکھوں شکنتلا، بن کر کالی داس

سانچ ہمارے راج میں، لکھنے کو ی قتیل
منتری لو تم گاڑ دو، اس کے ہاتھ میں کیل

ڈُوب مَرا اِک آدمی، آس اُمید سمیت
نکلی جب ہر سیپ سے، موتیوں بدلے ریت

مت بیکار میں بیٹھیو، بے گُن منش کے پاس
وہ اِک پھول کپاس کا، جس میں رنگ نہ باس

آئی جھولا جھولنے، گوری پیا کے سنگ
چُنری میں لہرا گئے، دھنک کے ساتوں رنگ

اُس نے گھونگھٹ کھول کر کی جب پیار سے بات
اَور بھی روشن ہو گئی پریت کی چاندنی رات

اِک پَل بھی اب چَین سے لیا نہ جائے سانس
پی بِن جو بھی سانس لُوں، بنے گلے کی پھانس

سب کی مَیلی آنکھ ہے، سب کے من میں کھوٹ
ساجن میرے پیار کو، چاہیے تیری اوٹ

جب چاہے مُنہ پھیر لے، دیکھے صُبح نہ شام
جیون ہے وہ بیسوا، دغا ہے جس کا کام

کاٹھ کی ہنڈیا باؤری، کاہے کرے غرور
بھسم کرے گی جھوٹ کو، سچ کی آگ ضرور

بُروں سے میٹھے بول کی، رکھیو کم کم آس
نیم کی یہ نمکولیاں، اِن میں کہاں مٹھاس

بِرگُن کب گُنوان تھا، لوگو دیکھتے جب داؤ
لوہا بیچ نہ پائے گا، وہ سونے کے بھاؤ

جب کہیں پورے تول کے، باقی رہنے باٹ
بکری مل کر شیر سے، پانی پیئے کس گھاٹ

بوجھو ہم میں کون ہے، ایسا پاگل شخص
بُرا لگے جسے آئینہ، دیکھ کے اپنا عکس

برسیں کسی پہ بدلیاں، لگے کسی گھر آگ
اپنے اپنے لیکھ ہیں، اپنے اپنے بھاگ

آج نیا اک چٹکلا، ہم نے سُنا قتیلؔ
کوّا جھیل کو پی گیا، ہاتھی لے گئی چیل

شہروں میں کیا شہر ہے، ہری پور اک شہر
جہاں رُوپ کی بارشیں، برسیں آٹھوں پہر

جب تپتے لاہور میں، چڑھے مہینہ چیت
آئیں یاد قتیلؔ کو، ہری پور کے کھیت

لندن ہو یا ماسکو، ٹرکی ہو یا شام
سب سے پیارا ہے مجھے، ہری پور کا نام

ماضی میں اس شہر نے، بہت کیا ناشاد
گئی نہ پھر بھی ذہن سے، ہری پور کی یاد

جوڑیں رشتہ پیار کا، ہری پور کے ساتھ
نرگس، جگنو، کوئلیں، تھریں اور باغات

گندم پسی مشین کی، کھائے سب لاہور
پن چکی میں جو پسے، اُس کا مزا کچھ اور

قریہ قریہ جھومتے، خوبانی کے پیڑ
جانے کون بلاؤں نے، جڑ سے دیے اکھیڑ

آپ رہیں سب عیش سے، بھوکے مریں کسان
شالا سدا جئیں مرے، ہری پور کے خان

یا رب کبھی نہ ماند ہو، میرے شہر کا رُوپ
بہتر تپتی چھاؤں سے، جس کی ٹھنڈی دُھوپ

تیری کیا ہے شاعری، کنول بناں اِک جھیل
شاعر دوہے انگ کا، تُو کیوں بنا قتیل

کہیں جسے عبدالرّحیم، وہ خانوں کا خان
دوہے لکھ کر بن گیا، کویتا کی پہچان

ہم نے اُردو شاعرو، خوب دِکھایا کام
میؔر کی لمبی بحر کا، دوہا رکھ دِیا نام

❋

کِتنے اس کے ماترے، یہی نہ جانے کو
دوہے کی گت دیکھ کے، دیا کبیرا رو

❋

پڑھ لے مرزا صاحباں غور سے جو اِک بار
وہ دوہے کے وزن میں کبھی نہ کھائے مار

❋

غزل کہو تو میؔر سی، مُجھ سا گیت کہو
دوہے لکھو کبیؔر سے، ورنہ چُپ رہو

رباعی

کس مُنہ سے کہوں مَیں ہُوں ثنا گر تیرا
لکھّا نہ گیا رُوئے منوّر تیرا
اُس روز مَیں کہلاؤں گا شاعر جس دن
لفظوں میں بنا سکوں گا پیکر تیرا

جتنے بھی خُدا ہیں انھیں پہچانتا ہُوں
اپنے سے بڑا کب انھیں گردانتا ہُوں
ہاں جس نے ترا حُسن کیا ہے تخلیق
بس وہ ہی خُدا ہے مَیں جسے مانتا ہُوں

دیتی رہی جو اُس کی ہم نشینی خوشبو
معلوم نہیں کس نے وہ چھینی خوشبو
لے بھاگا ہے شاید کوئی جاتا موسم
وُہ اُس کے بدن کی بھینی بھینی خوشبو

دِلدار کی مانند نہ بیلی کی طرح
تُو مُجھ سے مِلے یار، پہیلی کی طرح
اِک روز کھُلے دِل سے بغل گیر تو ہو
مہکے گا تِرا حُسن چنبیلی کی طرح

جانم، یہ رسیلی یہ کٹیلی آنکھیں
رہتی ہیں جو بے پیے نشیلی آنکھیں
ایسا نہ ہو آخر یہ ڈبو دیں مُجھ کو
یہ تیری سمندروں سی نیلی آنکھیں

دیکھ اپنی اداؤں سے نہ شرمایا کر
ہر محفلِ زرتاب پہ چھا جایا کر
ست رنگا دوپٹہ نہ اگر مل پائے
تُو صرف دھنک اوڑھ کے آجایا کر

رنگین کٹی، دِلکش و مسرُور کٹی
تھی زندگی جتنی بھی وہ بھرپور کٹی
بے کیف اگر تھی تو وہی تھی جاناں
جو عمر مری تُجھ سے ذرا دُور کٹی

جذبات کی اِک بزم سجا لے مرے ساتھ
ہر سانس میں اِک دیپ جَلا لے مرے ساتھ
شاید کہ مَیں پھر سوتا رہوں حشر تلک
ایک آدھ تو رُت جگا منا لے مرے ساتھ

جاں مَوت کے آویزے میں جڑ جاؤں گا
اَوروں کی طرح قبر میں گڑ جاؤں گا
مرنے کا نہیں خوف ذرا بھی مُجھ کو
غم یہ ہے کہ مَیں تجھ سے بچھڑ جاؤں گا

کہتے ہیں مے ناب یہ پابندی ہے
واعظ کا ہے فتویٰ کہ بہت گندی ہے
رندوں کی تواضع سے نہ چُوکے پھر بھی
اللہ کی یہ خاص کوئی بندی ہے

اے کاش کُچھ ایسا بھی قرینہ آ جائے
ساغر کی جگہ آنکھ سے پینا آ جائے
ہجرت کریں ہم لوگ جو میخانے سے
رستے میں اُن آنکھوں کا مدینہ آ جائے

دِل پر اثر شام وہی ہے کہ جو تھا
جذبات میں کہرام وہی ہے کہ جو تھا
بے رنگیِ حالات پہ مل کر میرے ساتھ
روتا ہُوا اِک جام وہی ہے کہ جو تھا

تُو آئے تو جنّت مرا گھر ہو جائے
یہ عمر سہولت سے بسر ہو جائے
ہم میں تو دِلوں کا ہے وہ رشتۂ جاناں
تُو روئے تو دامن مرا تر ہو جائے

کچُھ لوگ تو مرتے ہیں قضا کے ہاتھوں
کچُھ زہرہ جمالوں کی ادا کے ہاتھوں
لیکن مجھے تیرے لیے ڈر ہے یا شیخ!
مر جائے گا تو صبر و رضا کے ہاتھوں

اِک رند کو ناراض نہ کر اے ساقی
پھر ظلم کا آغاز نہ کر اے ساقی
بولیں گے مرے حق میں ترے جام و سبو
مُجھ کو نظر انداز نہ کر اے ساقی

محفوظ پسِ نقاب تو بھی تو نہیں
کانٹے ہیں جو ہم گلاب تُو بھی تو نہیں
واعظ ترے اعمال پہ سب کی ہے نظر
ناواقفِ احتساب تُو بھی تو نہیں

تُو صاحبِ اعجاز نہیں ہو سکتا
تجھ پر تو ہمیں ناز نہیں ہو سکتا
کرتا رہے کائیں کائیں کوّا کتنا
کوئل کا ہم آواز نہیں ہو سکتا

دُنیا کی ہر اک شے سے محبت ہے عظیم
واعظ نہیں کر سکتا دلوں کی تقسیم
تلوار چلائیے کہ چھری سے کاٹے
پانی تو نہیں ہو گا کسی طرح دو نیم

اے حضرتِ واعظ تری باتوں کے نثار
جن سے یہاں تکفیر کی چھائی ہے بہار
ہو سکتا ہے یہ تیرے سوا کس کا کام؟
بارانِ فتاوے ہے یہاں موسلا دھار

فطرت ہی نہیں فن بھی حسیں ہے میرا
مدّاح ہر اک ماہ جبیں ہے میرا
واعظ کی بھلا بات میں سمجھ لوں کیسے
واعظ کوئی معشوق نہیں ہے میرا

تُو عقل کے گُر ان کو سکھاتا کیوں ہے
لوگوں میں بھرم اپنا گنواتا کیوں ہے
چہرہ ہو کسی کا تو نظر آئے عکس
بے چہروں کو آئینہ دکھاتا کیوں ہے

ٹوٹی ہوئی بانہوں میں وہ بس لیتا ہے
بھوکا ہو تو کچھ روز ترس لیتا ہے
اس پر بھی نہیں سانپ کو ڈستا کوئی سانپ
انساں مگر انسان کو ڈس لیتا ہے

آئندہ نہ آنکھوں سے اٹھاؤں گا غلاف
کر دے یہ خطا اے مرے اللہ معاف
یہ دیکھ مرے ماتھے پہ تازہ اک زخم
بولا ہوں میں فرسودہ رواجوں کے خلاف

کاٹا ہوا تن سے یہ گلا کس کا ہے
ٹوٹا ہوا جیون کا سبو کس کا ہے
کچھ تم ہی بتاؤ عشق پیشہ لوگو!
یہ ریل کی پٹڑی پہ لہو کس کا ہے

سوکھا ہوا پتہ جو گرا ڈالی سے
اک پردہ اٹھا زیست کی پامالی سے
چھا جاتی ہے جس وقت بہاروں پہ خزاں
رونے کی صدا آتی ہے ہریالی سے

آفاق میں جنت کا نشاں ہے عورت
غارت گرِ فردوس کہاں ہے عورت
آدم سے کہو، اتنا پریشان نہ ہو
جنت وہی دھرتی ہے جہاں ہے عورت

عورت نہ کسی سے بھی یہاں کم ہوتی
شعلوں میں گندھی ہوئی وہ شبنم ہوتی
مردوں کے معاشرے نے بڑھنے نہ دیا
ورنہ یہی حکمرانِ عالم ہوتی

کھُلا ہُوا شیطان مِلا بھی تو کیا
اپنا اُسے عرفان مِلا بھی تو کیا
عورت کے بدن کی دلرُبائی کھو کر
گوتم کو جو نِروان مِلا بھی تو کیا

آباد اسی نے دِل کی وادی کی ہے
تاریخ نے اکثر یہ منادی کی ہے
عورت کی بڑائی کا یہ کافی ہے ثبوت
عورت سے پیمبروں نے شادی کی ہے

نظروں میں دھنک گھولتے دیکھا مَیں نے
سوچوں کی گرہ کھولتے دیکھا مَیں نے
وہ میری ہر اک بات پہ خاموش رہا
حُسن اُس کا مگر بولتے دیکھا مَیں نے

دُہرائی ہے یادوں نے کہانی اُس کی
آنکھوں میں ہے تصویر پُرانی اُس کی
وہ لوگ بتائیں گے قیامت کیا ہے
جن لوگوں نے دیکھی ہے جوانی اُس کی

لمحوں کا نشانہ کبھی ہوتا ہی نہیں
وہ صیدِ زمانہ کبھی ہوتا ہی نہیں
ہر عمر میں دیکھا ہے دمکتا وہ بدن
سونا تو پُرانا کبھی ہوتا ہی نہیں

خود جلوۂ حُسنِ ازلی ہو جاتا
پیتل سے مَیں سونے کی ڈلی ہو جاتا
گر اُس کی جگہ کرتا پرستش رب کی
مَیں اپنے زمانے کا ولی ہو جاتا

راجندر سنگھ بیدی، اُستاد دامن،
خواجہ خورشید انور اور فیض کے لیے
جو ایک کے بعد ایک ہم سے جُدا ہو گئے

اُجڑے ہیں دِلوں کے باغ باری باری
خالی ہُوئے سب ایاغ باری باری
تھی روشنی میخانے میں جن کے دَم سے
گُل ہو گئے وہ چراغ باری باری

ہر چند کہ پہلے بھی چھڑا موت کا راگ
لگتی رہی لفظوں کے محلات میں آگ
جس روز مگر جلی ہے بیدی کی چھت
اُس روز تو لُٹ گیا کہانی کا سہاگ

کب جھومتے موسم کی فضائیں دے گا
کیا پیار سے اب کوئی صدائیں دے گا
اِس حبس کے ماحول میں ہم لوگوں کو
دامن کی طرح کون ہوائیں دے گا

خورشید تھا وہ فن کو ضیا دیتا تھا
ہر تان سے اِک دیپ جلا دیتا تھا
کیا سرسوتی اُس سے چھپاتی چہرا ؟
وہ سرسوتی سُر کو بنا دیتا تھا

غنچہ تو گیا شمیم باقی ہے ابھی
اِک سلسلۂ قدیم باقی ہے ابھی
کچھ کم نہیں فیض کا بچھڑنا، لیکن
صد شُکر یہاں ندیم باقی ہے ابھی

دِل سے وہ کبھی دُور نہیں ہوتا ہے
مر جائے تو دھڑکن میں مکیں ہوتا ہے
جو شخص حسینوں میں جِیا ہو تا مرگ
اُس شخص کا مرنا بھی حسیں ہوتا ہے

جس سے ہو محبّت کوئی کرنے والا
وہ شخص نہیں ہوتا بکھرنے والا
جب کوئی حسیں بَین کرے لاشے پر
اِک بار تو جی اُٹھتا ہے مرنے والا

خماسی

برادرِ گرامی قتیل شفائی صاحب !

السلام علیکم

ایک بے نام صنف یعنی رباعی پر ایک مصرعے کے اضافے کے ساتھ آپ نے جو تجربہ کیا ہے وہ بے انتہا کامیاب رہا ہے ۔

یہ عریضہ لکھنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ آپ کی معلومات کے لیے عرض کروں کہ یہ صنف بے نام نہیں ہے ۔ ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ ایران میں رباعی پر اس قسم کے تجربے ہوئے اور وہ اس طرح تھے ۔

۱ ۔ رباعی سے ایک مصرعہ کم کر کے اسے ثلاثی کا نام دے دیا گیا ۔ ہمارے ہاں لوگ جو ثلاثی لکھتے ہیں وہ اس لیے ثلاثی نہیں کہلائی جا سکتی کہ اس تجربے کو پہلے ہی ثلاثی کا نام دیا جا چکا ہے چنانچہ ثلاثی تین مصرعوں کی وہ نظم ہوئی جو رباعی کے وزن پر ہو ۔

۲ ۔ رباعی پر ایک مصرعے کا اضافہ کر کے اُسے "خماسی" یا "پنج گانہ" کا نام دیا گیا ۔

۳- رباعی پر دو مصرعوں کے اضافے سے جو صنف ایجاد ہوئی اُسے "شش گانہ" کہا گیا۔

۴- رباعی پر تین مصرعوں کا اضافہ کیا گیا تو اُسے "ہفت گانہ" کہا گیا۔

مجھے خیال آیا کہ آپ کی نظر سے شاید فارسی کی جدید شاعری کی تاریخ اور خاص کر نئے تجربات کی تاریخ نہ گزری ہو اس لیے یہ چند باتیں لکھ رہا ہوں۔ شاید آپ اس صنف کو "خماسی" کا نام دینا پسند فرمائیں جو نہایت مناسب ہوگا اس لیے کہ ثلاثی اور خماسی رباعی ہی کے وزن پر ہیں۔

نیازمند:

ڈاکٹر الیاس عشقی

محترم عشقی صاحب!

سلام شوق

یہ درست ہے کہ جدید فارسی کے نئے تجربوں کی تاریخ میری نظر سے نہیں گزری اس لیے —— کہ "آپ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے" —— آپ سے پہلے بھی چند احباب نے مجھے یہی مشورہ دیا کہ میں اس صنفِ سخن کو "خماسی" کے نام سے پیش کیا کروں۔ اب آپ کا بھی یہی مشورہ ہے تو لیجیے سرِدست "خماسی" ہی کے عنوان سے بے نام سخن پارے حاضر ہیں۔ لیکن مجھے اتنا اور بتا دیجیے کہ ۱۹۲۰ء کے بعد اڑسٹھ برس کے عرصے میں کسی اُردو شاعر نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے؟

مخلص:

قتیل شفائی

مٹ جائیں نہ دُنیا سے کہیں حُسن و جمال
صحرائے بدن پر برس اے ابرِ وصال
اس بات کا اب تک نہیں کیا تجھ کو خیال
جس دشت میں پیاسا کوئی مرجاتا ہے
اس دشت میں چلتی ہی نہیں بادِ شمال

مذہب تھا مگر جنوں کا دھندا ہی تھا
حق گوئی کا کاروبار مندا ہی تھا
کیا شے تھا عقیدہ، ایک پھندا ہی تھا
دی جس کو اناالحق کی سزا دُنیا نے
وہ بھی تو خُدا کا نیک بندہ ہی تھا

راتیں تھیں حسین، دن تھے سہانے لوگو
یہ بات کوئی مانے نہ مانے لوگو
تم نے تو سُنے سارے فسانے لوگو
تم جانتے ہو کیا تھی جوانی اُس کی
اُس شہرِ طرب کے اے پُرانے لوگو

جذبات کی رَو میں نہ اگر بہہ جاتے
ہم کاہے کو اِک پھُول اُسے کہہ جاتے
بہتر تھا کہ دُور اُس سے کہیں رہ جاتے
کچھ زہر سے کم نہیں اب اُس پھُول کی باس
کانٹے کی چبھن ہوتی تو ہم سہہ جاتے

پینے کا جب اہتمام کرتا ہُوں مَیں
سب کے لیے اذنِ عام کرتا ہُوں مَیں
ہر شام یہ نیک کام کرتا ہُوں مَیں
پر زُہد کی اُتری نہ ترے رُخ سے نقاب
اے شیخ تجھے سلام کرتا ہُوں مَیں

حالات کو سازگار کرتے کرتے
ماحول کو خوشگوار کرتے کرتے
سامانِ وصالِ یار کرتے کرتے
پتھرا سی گئی ہیں مری آنکھیں لوگو
اِک شخص کا انتظار کرتے کرتے

سوچا تھا وہ خوشس جمال آجائے گا
اُس کو مرا جب خیال آجائے گا
پیغامِ شبِ وصال آجائے گا
درویش تھا مَیں یہ نہ خبر تھی کہ اُسے
شاہوں کی طرح جلال آجائے گا

باہنوں کے سبھی سنگار جھولوں جیسے
یہ رقص کے انداز بگولوں جیسے
ریشم سا بدن، گال ہیں پھولوں جیسے
اُس جانِ غزل کے ہیں خدوخال تمام
موزونیِ شعر کے اصولوں جیسے

فطرت کا حسیں طلسم تم بھی دیکھو
مہکا ہُوا اُس کا جسم تم بھی دیکھو
خوشبو کا مجسّم اِسم تم بھی دیکھو
جو پھول جوانی کی حرارت سے کھلیں
اُن پھولوں کی خاص قسم تم بھی دیکھو

اُس بُت سے جو رسم و راہ کرتا ہُوں مَیں
سب لوگ کہیں، گناہ کرتا ہُوں مَیں
اِس بات پہ جب نگاہ کرتا ہُوں مَیں
دِل کہتا ہے دِلبروں سے کیسے نہ مِلوں
واعظ سے بھی جب نباہ کرتا ہُوں مَیں

ہم وہ ہیں جنھیں زندگی پہچانتی ہے
اِک راہنما وہ ہمیں گردانتی ہے
ہم جھوٹ بھی کہہ دیں تو وہ سچ جانتی ہے
یہ سب ہے حقیقت تو بتا اے دُنیا
تُو بھی کِسی عاشق کو ولی مانتی ہے؟

تھا مجھ پہ چمکنے کو اک ایسا خورشید
ہوتی تھی نئے وصل کی جس سے تمہید
پُوری نہ ہوئی میرے لیے جب یہ نوید
دریافت کیا مَیں نے تو معلوم ہُوا
حالات نے کر دیا محبّت کو شہید

جذبات کو بے قرار دیکھا مَیں نے
احساس کو اشکبار دیکھا مَیں نے
نظروں کا یہ حالِ زار دیکھا مَیں نے
اپنا ہی نظر آیا وہ مرقد مجھ کو
جس شہر میں جو مزار دیکھا مَیں نے

رُودادِ شکستِ ذات پُوری کر لوں
گھٹتی بڑھتی حیات پُوری کر لوں
باقی ہے ذرا سی بات پُوری کر لوں
واعظ، ترا فرمان سر آنکھوں پہ، مگر
پہلے یہ گزرتی رات پُوری کر لوں

اُلجھا ہُوں تری زُلف کے بَل میں جاناں
رقصاں ہے تُو ہی میری غزل میں جاناں
نت رہنا اِسی رنگ محل میں جاناں
جس دن سے ہُوا تُو مری سوچوں میں شریک
صدیوں کا سفر طے ہُوا پَل میں جاناں

ساون کی جھڑی گیت سُناتی آئی
ماحول کو رنگین بناتی آئی
جو بوند بھی آئی گنگناتی آئی
آواز مجھے دی جو کسی بادل نے
توبہ مری جام کھنکھناتی آئی

بجلی میں پَر افشاں ہے اُجالا اس کا
بادل نظر آتا ہے دوشالا اس کا
پھر اس پہ غضب ہے قد بالا اس کا
چھڑ جائے کہیں ذکرِ قیامت تو قتیلؔ
دیتے ہیں وہاں لوگ حوالا اس کا

اُس شخص کے پیرہن کی باتیں کر کے
رنگینی و بانکپن کی باتیں کر کے
مہکے ہُوئے اِک بدن کی باتیں کر کے
گھٹتا نظر آتا ہے غمِ زیست کا بوجھ
اُس راحتِ جان و تن کی باتیں کر کے

✺

اپنے ہی نشے میں چُور آنکھیں اس کی
سنجیدہ و پُر غرور آنکھیں اس کی
میرے لیے نُور نُور آنکھیں اس کی
تابندہ ستاروں سے فلک پر جا کر
ملتی ہیں کہیں ضرور آنکھیں اس کی

✺

وعدے کی بس ایک شام باقی ہے ابھی
ہاں وصل کا اہتمام باقی ہے ابھی
اِک قرض میرا اُس کے نام باقی ہے ابھی
میخانے کے میخانے لنڈھائے، لیکن
اُس جسم کا ایک جام باقی ہے ابھی

رفتگاں

مولانا صلاح الدین احمد
فیض احمد فیض
ساحر لدھیانوی
تسکین قریشی
اکبر لاہوری

مولانا صلاح الدّین احمد

یاد پھر آئی ہے اُس کی اے دِل
جس نے بخشی تجھے پہلی دھڑکن
جس نے چھنکائے گھنے سنّاٹے
جس نے پہنائی لہُو کو جھانجھن

جس کا سایہ یہ چمکتی ہُوئی رُت
جس کا پرتو یہ ترنّم، یہ بہار
جس کے ہمراہی صبا کے جھونکے
جس کا ہم رقص بہاروں کا وقار

ہر قدم جس کا نشانِ منزل
یاد پھر آئی ہے اُس کی اے دِل

وہ کہ مر کر بھی امر ہے یارو
ہم اُسے یاد کیے جائیں گے
ہم بھلائیں گے تو قرطاس و قلم
اُس کی عظمت کی قسم کھائیں گے

وہ اُفق پار کسی وادی سے
ہم کو آواز دِیے جائے گا
آسمانوں کا وہ ہمسر ہم کو
ذوقِ پرواز دِیے جائے گا

کل بھی جو ہم میں رہے گا شامل
یاد پھر آئی ہے اُس کی اے دل

سپنوں کا بنجارہ ——— فیض

وہ ایک ایسا شخص تھا
جس کے لیے
بس ایک رائے سب کی تھی
"پیارا — بہت پیارا ہے وہ
سپنے سہانے پیار کے
بانٹے جو گاؤں گاؤں میں
ایک ایسا بنجارہ ہے وہ"

"ساری زمیں جس کا وطن
سارا جہاں جس کا مکاں
سب لوگ جس کے ہم سخن
سب لوگ جس کے ہم زباں
جس نے تراشیں منزلیں
جس نے بنائے کارواں
چل کر دِلوں کی راہ سے
چھو لی ہے جس نے کہکشاں"

"وہ روشنی کی کھوج میں
چلتا رہا — چلتا رہا
چہرے پہ وہ گردِ سفر
مَلتا رہا — مَلتا رہا
وہ آندھیوں کے درمیاں
جَلتا رہا — جَلتا رہا
وہ زندگی کے حُسن میں
ڈھلتا رہا — ڈھلتا رہا"

وہ نغمہ خواں تھا پیار کا
وہ عشق کا ہم رقص تھا
وہ تنگدل واعظ نہ تھا
اُس میں یہی اِک نقص تھا
کہتے رہے اُس کو بُرا دَیر و حرم
لیکن یہ رائے سب کی تھی اُس کے لیے
"پیارا — بہت پیارا ہے وہ
سپنوں کا بنجارہ ہے وہ —"

ساحر کے لیے

یہ اُس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

وہ اِک بیمارِ غم جو زندگی بھر کم سے کم سویا
نہ وہ جی بھر کے خود سویا نہ کوئی اُس کا غم سویا
جو سویا بھی تو گویا دو گھڑی لینے کو دَم سویا
مگر اب کے وہ اپنے درد کی کھا کر قسم سویا
کبھی پہلے نہیں تھی بے قراری جو اسے اب تھی
یہ اس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

اسے معلوم تھا اس کا لہو ہے سرد ہونے کو
کِھلا تھا اس کا چہرہ آج کی شب زرد ہونے کو
دُوا تھی منتظر اُس کی سراپا درد ہونے کو
نہ وہ خاطر میں لایا حسرتوں کے گرد ہونے کو
بھلا حسرت کوئی اس ناتواں پر مہرباں کب تھی
یہ اس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

جو باقی مے تھی اُس کی زندگی کے آبگینے میں
وہ مے اُس نے رلا دی موت کے ٹھنڈے پسینے میں
پھر اس کے بعد جا بیٹھا وہ اِک ٹُوٹے سفینے میں
اُترنا تھا اُسے دریا کے ناہموار سینے میں
وہ دریا چند برسوں سے روانی جس کی بےڈھب تھی
یہ اُس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

غزالاں خوب واقف ہیں کہ ماتم ہو رہا ہو گا
دِوانہ مر گیا، ویرانہ اُس کو رو رہا ہو گا
وہ خود ہی جانتا تھا جو بھی غم اُس کو رہا ہو گا
مگر اب چین سے اپنی لحد میں سو رہا ہو گا
سُنا ہے جب وہ سویا مسکراہٹ زینتِ لب تھی
یہ اُس بیمارِ غم کے جاگنے کی آخری شب تھی

فکرؔ تونسوی

فکرؔ تونسوی مرا حبیب تھا
میری جان سے بھی وہ قریب تھا

جس چمن میں اشتراکِ خار و گُل
وہ اُسی چمن کا عندلیب تھا

بَیر اُس کو تھا سیاہ رات سے
اِک نئی سحر کا وہ نقیب تھا

پیار کے جواہر اس کی ملکیت
یہ ہے سب غلط کہ وہ غریب تھا

دے سکا نہ چین اپنے جسم کو
اَن گنت دِلوں کا جو طبیب تھا

رو رہے تھے اس کو شیخ و برہمن
مر کے بھی وہ کتنا خوش نصیب تھا

اُس کو بھی تھا عشق ساری خلق سے
یوں قتیلؔ وہ مرا رقیب تھا

اکبر لاہوری

وہ مست قلندر تھا——

وہ رونقِ ہر محفل

وہ پیار کا شیدائی

کرتا تھا محبت سے

یاروں کی پذیرائی

یاد آتی ہے جب اُس کی

وہ انجمن آرائی

محسوس یہ ہوتا ہے

وہ ناپتے لفظوں کا

بے چین سمندر تھا

وہ مست قلندر تھا

نغمات کی خوشبو سے

مہکائے چمن اُس نے

جذبات کی حدّت سے

گرمائے بدن اُس نے

لمحات کو صدیوں کے

پہنائے بَرن اُس نے

تھا شوخ بہت لیکن

جو لفظ بھی تھا اُس کا

آداب کے اندر تھا

وہ مست قلندر تھا

آتی تھی نظر اُس کے

جذبات کی شادابی

چھوٹی ہو اندھیرے میں
جیسے کوئی مہتابی
اک آنکھ جو اُردو تھی
اک آنکھ تھی پنجابی

یارو یہ حقیقت ہے
اس مُلکِ منوّر میں
وہ فن کا سکندر تھا
وہ مست قلندر تھا